labaik ya Hussain AS
ایک سفر کی یادیں
پیغمبروں کی سرزمین
یعقوب نظامی
anjumhasnain2008@yahoo.com
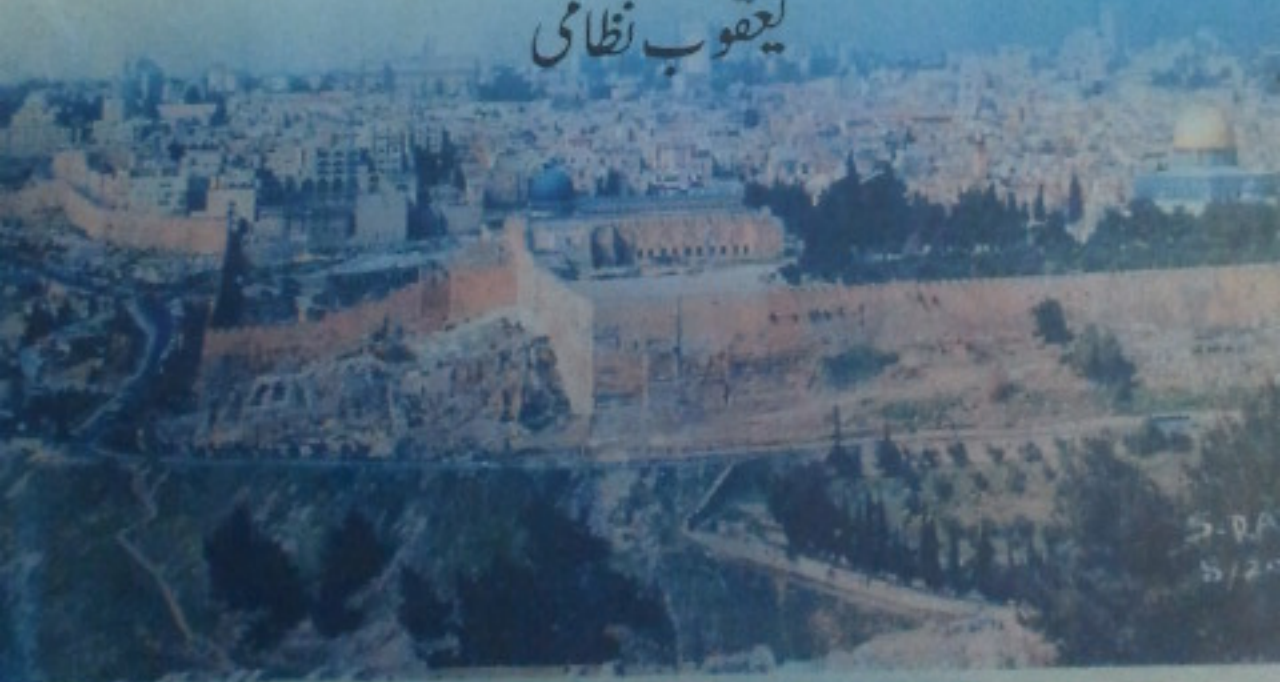
یعقوب نظامی کی پہلی کتاب "پاکستان سے انگلستان تک" چھپی تھی۔ تو اسے ہاتھوں ہاتھ لیا گیا تھا۔ اب ان کی دوسری کتاب "پیغمبروں کی سرزمین" چھپ رہی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اس کی پذیرائی پہلے سے بڑھ کر ہوگی۔ بچشم ودل ہوگی اور نقش ثانی نقش اول پر حاوی ہوگا۔

اس کتاب میں مذہب کی بونداباندی (موسلا دھار بارش نہیں) شروع سے لے کر آخر تک ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ اس پر مستزاد صاحب کتاب کا انداز بیاں ہے۔ جو کبھی ہلکے پھلکے مزاح اور کبھی مذہبی پس منظر کے باعث ہر طرح کے قاری کو شروع سے لے کے آخر تک اپنے ساتھ رکھتا ہے۔

"پیغمبروں کی سرزمین" کا سفر کرتے ہوئے مصنف کے ساتھی ایسے حاجی حضرات ہیں جن میں سے بعض یہ سفر پہلے بھی کر چکے ہیں اور اکثر مزاروں کی زیارت کے تجربے سے سرشار ہیں۔ لیکن کلین شیو یعقوب نظامی ان کے تجربات سے بے نیاز، راستے کے ہر قصبے، ہر شہر اور ہر زیارت کو ایسے زاویہ سے دیکھتے ہیں جس میں عقیدت کا جذبہ تو بہر حال ہے لیکن عقل کی کسوٹی بھی مصروف کار ہے۔

وقت نے تاریخ کے گرد فسانہ وفسوں کے جالے بن رکھے ہیں۔ یعقوب نظامی نے دلائل اور علم کے ذریعے ان جالوں کو صاف کر کے حقیقت کو نمایاں کیا ہے۔ اس سلسلہ میں عراق اور اسرائیل کے کوائف بالخصوص خیال انگیز ہیں۔

محمود ہاشمی

برمنگھم۔ برطانیہ

ایک سفر کی یادیں

یعقوب نظامی

24-مزنگ روڈ ○ لاہور فون:0092-42-7322892

E-mail:nigarshat@yahoo.com nigarshat@wol.net.pk

نام کتاب : پیغمبروں کی سرزمین

مصنف : یعقوب نظامی

اہتمام اشاعت: آصف جاوید

نگارشات 24-مزنگ روڈ ○ لاہور

مطبع : المطبعتہ العربیہ، لاہور

سرورق : سلیم رضا

کمپوزنگ : فضیلہ یوسف

اشاعت اول: جنوری 2001ء

اشاعت دوم: جنوری 2002ء

اشاعت سوئم: جنوری 2003ء

قیمت: 250 روپے

انتساب

حاجی نذیر حسین اور باجی ستارہ لطیف خانم

کے نام

جن کی بدولت یہ سفر ممکن ہوا۔

ترتیب

☆☆☆

اپنی بات

یہ کتاب جنوری 2001ء میں منظر عام پر آئی۔ خوشی کی بات ہے کہ اس کا پہلا ایڈیشن ایک مہینے میں ہی ختم ہوگیا۔ مارچ میں میرا پاکستان جانا ہوا تو لاہور میں "نگارشات پبلشرز" کے سربراہ محترم آصف جاوید صاحب سے ملاقات ہوئی۔ اُن کا کہنا تھا کہ کتاب کی بڑھتی ہوئی مانگ کے پیش نظر ضروری ہے کہ اس کا دوسرا ایڈیشن جلد از جلد شائع کیا جائے۔ میں بھی یہی چاہتا تھا۔ لیکن حالات نے کچھ ایسی صورت اختیار کی کہ اس معاملہ میں تاخیر ناگزیر ہوگئی۔

میں واپس انگلستان پہنچا تو میری خوش دامن محترمہ معروف بیگم کینسر کے موذی مرض سے شکست کھا کر مجھے، میری رفیقۂ حیات پروفیسر شمیم نظامی اور بچوں کو اتوار 8 اپریل 2001ء کو اس جہاں میں چھوڑ کر خود ابدی سفر پر روانہ ہوگئیں۔ میری خوش دامن نے مجھے اپنے بچوں سے بڑھ کر پیار دیا تھا۔ سچی بات یہ ہے کہ اگر برطانیہ میں میری خوش دامن نہ ہوتیں، تو مجھے وہ پرسکون ماحول شاید کبھی میسر نہ آتا جس کی بدولت میں نے کتابیں لکھیں اور اپنی یہاں کی ملازمت کی ذمہ داریوں سے ہنستا کھیلتا نبٹتا رہا۔ اس صدمہ کا احساس شمیم کو مجھ سے زیادہ تھا کہ شمیم کے والد اور میرے سسر محمد ابراہیم صاحب بیس سال پہلے ہی اس دنیا سے رخصت ہوگئے تھے۔ میری بیٹیاں نفیسہ، شمائلہ، سعدیہ اور بیٹا خرم اپنی نانی اماں سے اس قدر مانوس تھے کہ جب میت کو بریڈفورڈ کے مقامی قبرستان سکول مور کی قبر نمبر 963 میں

اُتارا جا رہا تھا تو بیٹی نفیسہ غم سے نڈھال ہو کر بے ہوش ہو گئی۔ اور گھر واپس آنے کی بجائے ہسپتال جا پہنچی۔ یوں کتاب کے نئے ایڈیشن میں اضافہ کرنے کے جو منصوبے سوچتے ہوئے انگلستان واپس آیا تھا سب کے سب دھرے کے دھرے رہ گئے۔

دوسرے ایڈیشن میں تاخیر کا سبب اسی طرح کے مسائل تھے۔

اب جب کہ دوسرے ایڈیشن کے لئے کتاب کا مسودہ اضافوں کے ساتھ تیار ہے، میں ''پاکستان رائٹرز فورم آزاد کشمیر'' کے صدر ماجد فرحت کا شکر گزار ہوں جنہوں نے اس کتاب کی تقریب رونمائی ''الجبیر'' ہوٹل میرپور آزاد کشمیر میں منعقد کروائی۔ پہلا ایڈیشن فوری فروخت ہو جانے کی بناء پر کتاب مارکیٹ سے دستیاب نہیں تھی۔ چنانچہ بابائے گوجری محترم فضل حسین رانا نے اپنے بیگ سے کتاب کا ذاتی نسخہ نکال کر حاضرین کو دکھایا۔ اس موقع پر بابائے گوجری کے علاوہ خطہء کشمیر کی معروف شخصیت عبدالخالق انصاری، ریٹائرڈ پرنسپل پروفیسر عبدالواحد قریشی، پروفیسر عرفان چوہدری، پروفیسر غازی علم الدین، پروفیسر منیر احمد یزدانی، پروفیسر عارف کمپلوی اور ڈاکٹر یوسف طارق نے کتاب کے بارے میں نہایت خوش کن تاثرات کا اظہار کیا۔ جن سے میری ہمت افزائی ہوئی۔

آخر میں اپنے اُن تمام قارئین کا شکریہ ادا کرتا ہوں جنہوں نے کتاب کو پڑھا اور مجھے خط لکھ کر اپنی رائے سے نوازا۔

جمعہ 3 اگست 2001ء

یعقوب نظامی

بریڈفورڈ۔ انگلستان

257 Legrams Lane
Bradford West Yorkshire
England BD7 2EJ
Tel: 01274 522658
E-mail: yaqubnizami@hotmail.com
E-mail: nizami786@fsmail.net

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مجھے کچھ کہنا ہے

برطانیہ میں قریباً بیس لاکھ مسلمان آباد ہیں۔ان میں سے اکثریت کا تعلق پاکستان، بھارت، بنگلہ دیش اور مشرق وسطیٰ سے ہے۔ یہ لوگ مختلف وقتوں میں برطانیہ آ کر آباد ہوئے۔اب انہوں نے برطانیہ کو ہی اپنا گھر تسلیم کر کے اپنا کردار ادا کرنا شروع کر دیا ہے۔ برطانیہ میں محنت مزدوری کی غرض سے آنے والے لوگوں میں سے آج چوہدری محمد سرور دارالعوام اور لارڈ نذیر احمد آف رادھرم دارالامراء تک جا پہنچے۔ان کامیابیوں کے علاوہ ہمارے لوگ برطانوی زندگی میں معاشی، معاشرتی، سیاسی اور مذہبی میدان میں بڑے معرکہ آرا کام کر رہے ہیں۔

1992ء میں بریڈفورڈ میں مقیم حاجی نذیر حسین، یعقوب علی اور قاسم خان کے دل میں یہ نیک خیال آیا کہ رمضان کے دوران مسلمانوں کی مذہبی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لئے خصوصی ریڈیو سٹیشن ہونا چاہئے۔انہوں نے یہ تجویز برطانیہ کی ریڈیو اتھارٹی کو پیش کی تو انہوں نے مطالبہ منظور کر لیا۔ یوں برطانیہ کی تاریخ میں پہلا ریڈیو رمضان بریڈفورڈ میں قائم ہوا۔اس کے نقش قدم پر چلتے ہوئے آج برطانیہ کے دوسرے شہروں میں ریڈیو رمضان قائم ہو رہے ہیں۔ یہ ریڈیو جہاں مقامی مسلمانوں کی ضرورتوں کو پورا کر رہے ہیں، وہاں دنیا کے غریب مسلمانوں کے لئے فنڈز بھی جمع کرتے ہیں۔

1999ء میں بریڈفورڈ میں ریڈیو رمضان کا لائسنس آواز میڈیا کو ملا۔ جنہوں نے

عراق اور کشمیر کے ضرورت مند مسلمانوں کے لیے مدد کی اپیل کی تو لوگوں نے اپنے دل اور جیبیں کھول دیں۔ عورتوں نے زیورات اور بچوں نے اپنے جیب خرچ کے پیسے بھی امدادی فنڈ میں جمع کروائے۔ بریڈفورڈ اور گردونواح کے مسلمانوں نے ملکر 1,48,000 پونڈ کی خطیر رقم جمع کی۔ اس رقم میں سے 47,000 پونڈ عراق کے لئے جمع ہوئے تھے۔

عراق پر بین الاقوامی پابندیوں کی وجہ سے اس رقم کو عراق پہنچانا ایک مشکل کام تھا۔ چنانچہ بریڈفورڈ سے ایک وفد کی یہ ذمہ داری لگائی گئی کہ وہ یہ رقم مستحق لوگوں تک پہنچائے۔ میں اسی وفد میں شامل ہوا اور جو کچھ دیکھا، سنا اور محسوس کیا اُسے میں نے اس کتاب میں پیش کر دیا۔

میرے سفر کا سبب اور محرک حاجی نذیر حسین اور باجی ستارہ لطیف خانم تھیں۔ جنہوں نے میرے سفری اخراجات برداشت کیے۔ اگر حاجی صاحب یہ فیاضی نہ کرتے تو ممکن ہے میں اس سفر سے محروم رہ جاتا اور قارئین میرے اس سفر کی یادوں تک نہ پہنچ سکتے۔ میں، حاجی صاحب اور باجی ستارہ لطیف خانم کا دل کی گہرائیوں سے شکریہ ادا کرتا ہوں۔

میں، کشمیر ہیلتھ کلچرل ویلفیئر ٹرسٹ (یو۔کے) کے چیئرمین حاجی رشید صاحب اور جاوید چوہدری صاحب کا شکریہ ادا کرتا ہوں جنہوں نے کتاب کا ٹائٹل تیار کرنے میں معاونت کی۔

میں والد محترم مولوی محمد اسماعیل اور والدہ مرحومہ کا انتہائی احسان مند ہوں۔ جنہوں نے بچپن سے مجھے دین کے اس راستہ پر لگایا جو راست باز لوگوں کا راستہ ہے۔ اگر والدین مجھے بچپن سے دین کا راستہ نہ دکھاتے تو ممکن ہے میں مغرب کی چکا چوند روشنیوں اور چمکتے چہروں سے متاثر ہو کر اپنا قلبی لگاؤ "پیغمبروں کی سرزمین" کی بجائے مغرب کی رنگینیوں سے لگا بیٹھتا۔

خوشبوؤں سے مہکتے گھر کی ملکہ شمیم، جس کی مہک کوئی پندرہ سال پہلے مجھے پاکستان سے انگلستان کھینچ لائی تھی۔ جب سے میں انگلستان آیا، شمیم کے گھر میں رہتا ہوں اور وہ میرے دل میں رہتی ہے۔ مساوات کے انہی اصولوں کے سبب گھر میں خوشیاں ہی خوشیاں

ہیں۔ اسی مہکتے گھر کے آنگن میں نفیسہ، شمائلہ، سعدیہ اور خرم تتلیوں کی طرح اُڑتے پھرتے گھر کی خوشیاں دوبالا کرتے ہیں۔ ان سب نے مجھے لکھنے کے لئے وقت اور پرسکون ماحول فراہم کیا۔ میں ان سب کا شکرگزار ہوں۔

برادرم محمد ایوب صابر ایڈووکیٹ' جو بچپن سے میرے آئیڈیل اور رول ماڈل رہے ہیں، نے مجھے سفری روئیداد قلم بند کرنے کی تاکید کی۔ برادر عزیز ڈاکٹر یوسف طارق نے بہت سی کتابیں خرید کر پاکستان سے بھجوائیں۔ برادرم محمد صالح متین صدر معلم ہائی سکول کھاڑک اور برادرم الحاج میاں محمد یونس نے بھی کتاب لکھنے کا اصرار کیا۔ لیکن جس شخصیت کی بات دل کو لگی وہ میرے برادر زادے پروفیسر الیاس ایوب ہیں۔ جو پیدائشی طور پر بصارت سے محروم ہونے کے باوجود پنجاب یونیورسٹی لاہور سے ایم اے انگلش ہیں۔ اور آج کل میر پور کالج میں اپنے علم کی روشنی سے دوسروں کے گھر منور کر رہے ہیں۔ الیاس ایوب کی پرعزم شخصیت نے مجھے یہ مشکل کام کرنے کا حوصلہ عطا کیا۔

ظہور آرٹسٹ جنہوں نے دریائے فرات کے کنارے میری وہ تصویر کھینچی جو اس کتاب کی پشت پر ہے، منیر حسین صاحب اور انکی صاحبزادی حمیرا حسین نے کتاب کی تصویروں کو قابل اشاعت بنانے میں فوٹو گرافی کے جوہر دکھائے، سلیم رضا جنہوں نے کتاب کا ٹائٹل ڈیزائن کیا۔

اے۔ حفیظ اور محمد ابوحمزہ نے اس سفری داستان کو پڑھنے کے بعد مشورے دیے اور پروف ریڈنگ بھی کی۔ میں ان سب کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔

میرے وہ تمام دوست واحباب شکریے کے مستحق ہیں جنہوں نے کتاب لکھنے کے لئے میری حوصلہ افزائی کی اور مجھے کتابیں اور دوسرا مواد فراہم کیا۔

روزنامہ جنگ لندن کے فیضان عارف کا میں شکریہ ادا کرتا ہوں۔ جنہوں نے کتاب کا فلیپ لکھا۔

آخر میں محبی و محترمی محمود ہاشمی صاحب کا دل کی اتھاہ گہرائیوں سے شکریہ جنہوں نے کتاب کے مسودے کو پڑھا' مجھے مشوروں سے نوازا اور کتاب کا تعارف لکھا۔

یعقوب نظامی

بریڈفورڈ۔انگلستان

22 ستمبر بروز جمعہ 2000ء

E-mail: yaqubnizami@hotmail.com

E-mail: nizami786@fsmail.net

بریڈفورڈ سے دمشق براستہ لندن

17 نومبر 1999ء بروز بدھ "پیغمبروں کی سرزمین" کے سفر پر روانگی سے قبل صبح سویرے غسل کیا، کپڑے پہنے۔ پھر بیٹی نفیسہ، شائلہ، سعدیہ اور بیٹے نرم کو گلے لگا کر پیار کیا۔ شمیم سے رخصت لے رہا تھا کہ پونے سات بجے اے۔ حنیفا تشریف لائے۔ جنہوں نے میرا سفری بیگ گاڑی میں رکھا اور مجھے ساتھ لیکر حاجی کرامت حسین کے گھر پہنچا دیا۔ جہاں سفر پر روانہ ہونے والے سارے ساتھی جمع تھے۔

آج برطانوی سردی اپنا زور دکھا رہی تھی۔

لیکن پھر بھی..........!

قافلہ کو خدا حافظ کہنے کافی تعداد میں لوگ جمع تھے۔ سب لوگ سردی سے کانپنے کے باوجود گاڑی کے روانہ ہونے تک موجود رہے۔

گاڑی میں بیٹھنے لگے تو حاجی نذیر حسین صاحب بولے۔

"سفر پر روانہ ہونے سے قبل دعا مانگ لیجئے۔"

سب نے ہاتھ اٹھائے دعا مانگی۔

اور پھر..........

ایک ایک کر کے دوست احباب نے زائرین کو گلے لگا کر رخصت کیا۔ میں نے محسوس کیا کہ لوگوں میں اس قدر مذہبی جوش، جذبہ اور مقدس سرزمین سے عقیدت تھی کہ بہت سے احباب نے ہمارے ہاتھوں کو بوسے دیئے، چوما اور بڑے عجز اور انکساری سے کہا:

"پیغمبروں کی سرزمین پر پہنچ کر ہماری مغفرت اور بخشش کے لئے بھی دعا کیجئے

گا"۔ جب پیار محبت میں بدل کر عشق کی صورت اختیار کر لے تو یہی کیفیت ہوتی ہے۔

ہم سب سے دعائیں کرنے کے وعدے کرتے، الوداع کہنے والوں کو گلے لگاتے' ہاتھ ملاتے گاڑی میں بیٹھتے گئے۔

گاڑی میں میری نشست کے ساتھ حاجی محمد یونس اویسی بیٹھے تھے۔ پچھلی نشستوں پر حاجی کرامت حسین، حاجی رشید اور حاجی شاہ پال تھے۔ اگلی نشست پر کیتھلے کے حاجی یعقوب' مڈلز برو کے حاجی اسماعیل اور انکی بیوی گلزار بیگم تھیں۔ ڈرائیور کے پہلو میں حاجی رحمان اور ظہور آرٹسٹ تھے۔

بریڈفورڈ سے گاڑی ساڑھے سات بجے چلی۔

اگلی نشستوں پر خاموشی تھی لیکن ہماری نشستوں پر گپ شپ اور ہلا گلا تھا۔ گاڑی چلی تو حاجی یونس اویسی نے پرہیز، صبر اور تقویٰ پر لیکچر دینا شروع کر دیا۔ لیکن حاجی کرامت حسین کی شعلہ بیانی اور پھل جھڑیوں نے بات چیت کا رخ مذہب سے سیاست کی طرف پھیر دیا۔

جب ہم لیسٹر پہنچے تو حاجی یعقوب نے کہا:

"اہل کیتھلے نے مجھے گیارھویں والی سرکار (غوث اعظم رحمتہ اللہ علیہ) کے لئے پیسے دیئے ہیں تا کہ میں وہاں نذر و نیاز کروں۔" یہ سنتے ہی مڈلز برو کے حاجی اسماعیل نے اپنی بیگم سے کوئی مشورہ کیا اور پھر بولے:

"میں بھی گیارھویں والی سرکار کے نام پر گھر سے سموسے، پکوڑے اور کباب لایا ہوں۔ دعا بھی مانگ لی ہے۔ آیئے! سب ساتھی کھائیں۔"

اہل قافلہ کو کیا چاہئے تھا؟

نیاز .... اور وہ بھی گیارھویں والی سرکار کے نام کی۔ سب نے پیٹ بھر کر نیاز کھائی' ڈکار مارے، اللہ کا نام لیا اور گاڑی کے ماحول اور فضا کو کری مسالہ سے معطر کیا۔

میں کھانے پینے کا مرد میدان نہیں اور پھر نیاز تو غریب غرباء کے لئے ہوتی ہے یہ سوچ کر میں نے معذرت کر لی لیکن بیگم حاجی اسماعیل نے کہا:

"بیٹے یہ نیاز ہے۔ نیاز کھانے سے انکار نہیں کرنا چاہئے۔ اس طرح گیارھویں

والے سرکار ناراض ہو جاتے ہیں۔"

یہ سن کر مجھے اپنی ماں یاد آئی۔

ماں جی بھی اکثر ہم بہن بھائیوں کو اسی انداز میں تلقین کیا کرتی تھیں۔ یہ مائی عمر اور شکل سے مجھے اپنی ماں کی طرح نظر آئیں۔ اور پورے سفر میں میں نے ان کا اسی طرح احترام کیا جس طرح ماں کا احترام واجب ہے۔

گاڑی لیوٹن کے سروس سٹیشن پر پندرہ منٹ کے لئے کھڑی ہوئی۔ پھر چلے تو سوا بارہ بجے ہیتھرو کے ہوائی اڈے پر رُکے۔

کیتھلے کے خالد حسین اور ان کا دس سالہ بیٹا نصرت، رادھرم کے حاجی غنی اور انکی بیگم منظور، ہمشیرہ فاطمہ، حاجی سلیمان اور حاجی رحمان نے ہمیں ہیتھرو کے ہوائی اڈہ پر ملنا تھا۔ آہستہ آہستہ سب آملے۔ لیکن کشمیر کراؤن بیکری بریڈفورڈ والے ظہور صاحب غائب تھے۔ فلائیٹ کا وقت بھی لحہ بہ لحہ قریب آرہا تھا۔

حاجی کرامت حسین نے پریشان ہو کر ان سے موبائل فون پر رابطہ قائم کیا تو پتہ چلا وہ ابھی تک ڈوور (Dover) کی بندرگاہ پر ہیں جہاں سے بروقت پہنچنا مشکل تھا۔ سب نے فیصلہ کیا کہ ظہور کو رہنے دو اگر انہوں نے آنا ہوا تو دوسری فلائیٹ سے آجائیں گے۔

چنانچہ ہم نے ان کا پاسپورٹ اور ٹکٹ کاؤنٹر پر چھوڑے اور خود آگے بڑھ گئے۔

سوا دو بجے کے ایل ایم (KLM) کے جہاز نے ہیتھرو سے اڑان لی۔ جہاز اڑا تو حاجی کرامت حسین بولے:

"مجھے افسوس ہے کہ ظہور ساتھ نہیں آیا۔ ویسے میں نے حاجی مصدق حسین کو بھی ساتھ آنے کی دعوت دی تھی لیکن وہ مسلک کی بناء انکار کر گئے۔ حالانکہ میں نے انہیں تسلی دی تھی کہ آپ کو قبر والوں سے کوئی خطرہ نہیں۔ مردے قبروں سے اٹھ کر کسی کو نہیں پکڑتے۔"

یہ سن کر سب ہنسنے لگے۔

باتیں کرتے پتہ ہی نہ چلا کہ ایک گھنٹہ گزر گیا ہے۔ اگر جہاز ہالینڈ کے دارالحکومت ایمسٹرڈم میں نہ اُترتا تو شاید ہمیں اُس وقت بھی معلوم نہ ہوتا کہ وقت بہرحال گزر رہا ہے۔ ایمسٹرڈم سے جہاز تبدیل کیا۔ مقامی وقت کے مطابق سوا چھ بجے ہم نے پھر اُڑان لی۔ جہاز

کے کپتان نے اعلان کیا کہ ہم چار گھنٹے کے بعد بیروت میں اُتریں گے۔
جہاز کا جائزہ لیا تو کے ایل ایم (KLM) نے ادھیڑ عمر کی عورتوں کو فضائی میزبانی کے فرائض سونپے ہوئے تھے۔ اطمینان ہوا کہ اس عمر کی میزبانوں سے کسی کے ایمان کو کوئی خطرہ نہ تھا۔

ٹھرکی بابے

سفر پر سکون تھا۔ میں مطالعہ میں مصروف تھا کہ حاجی کرامت حسین کی آواز گونجی:
''او حاجیو! تساں ہن تھیں ''زیارتاں'' کرنیاں شروع کری شوڑیاں''۔
(حاجیو! آپ نے ابھی سے ''زیارتوں'' کا سلسلہ شروع کر دیا ہے)۔
میں نے آنکھ اٹھا کر دیکھا تو ہمارے دو حاجی صاحبان ایک ادھیڑ عمر کی فضائی میزبان کو ٹکٹکی باندھ کر تاڑ رہے تھے۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے وہ نصرت فتح علی کی قوالی شروع کرنے ہی والے ہیں کہ:
''کیسے چہرے سے نظریں ہٹائیں کہ تم میں ہے رب دکھتا...... دکھتا...... دکھتا!''
حاجیوں کو اس حالت میں دیکھا تو میں سوچنے لگا: کہیں ایسا تو نہیں کہ ہمارے حاجی کرامت حسین بھی یہی ثواب حاصل کر رہے تھے کہ مفادات کی جنگ شروع ہو گئی اور جب دال گلتی نظر نہ آئی تو ان کا بھانڈا سر بازار پھوڑ دیا۔

پی آئی اے PIA کی یاد آئی

ہم میں سے اکثر لوگ پی آئی اے (PIA) کی شکایتیں کرتے رہتے ہیں کہ وہ کھانا نہیں دیتے، ڈرنک نہیں دیتے۔ یہ نہیں کرتے وہ نہیں کرتے!
لیکن آج کے ایل ایم (KLM) نے جب چیز برگر (Cheese Burger) نما ٹھنڈا کھانا پیش کیا تو اس وقت پی آئی اے کا گرما گرم چکن پلاؤ، بریانی اور کباب بہت یاد آئے۔ فضائی میزبانوں کی طرف سے ادب آداب کے اظہار میں گرم جوشی تھی لیکن کھانے پینے کا معاملہ کافی ٹھنڈا رہا۔
کے ایل ایم KLM پر میں پہلی بار سفر کر رہا تھا۔ میں نے اِدھر اُدھر دیکھا تو رادھرم

سے ہمارے قافلہ میں شامل حاجی غنی کی بیوی منظور بیگم اور ہمشیرہ فاطمہ بیگم نے اپنے تھیلوں سے پراٹھے نکالے اور پالک گوشت کے ساتھ کھانے شروع کر دیئے۔

میں نے پوچھا کہ: "آپ جہاز کا کھانا کیوں نہیں کھاتیں؟"

انہوں نے جواب دیا:

"بابو جی! یہ بھی کوئی کھانا ہے بھلا۔ ہم کوئی مال مویشی ہیں جو یہ ہریالی کھائیں۔ ہمیں پتہ تھا اس لئے ہم گھر سے پراٹھے پکا کر لے آئے۔"

پھر مجھ سے پوچھا۔

"آپ بھی کھائیں گے!"

میں نے معذرت کر لی۔

اگر چیز برگر اور گھریلو پراٹھے والی بات پی آئی اے (PIA) والوں کو معلوم ہو جائے تو وہ حق بجانب ہوں گے اگر اپنی اشتہاری مہم میں کے ایل ایم (KLM) کا حوالہ دیکر مسافروں سے یہ کہیں کہ:

پھر بھی ہم سے یہ گلہ ہے کہ وفا دار نہیں
ہم وفا دار نہیں تو بھی تو دلدار نہیں

میں نے محسوس کیا۔ جوں جوں آپ ایک علاقے، ملک یا براعظم سے دوسرے میں جاتے ہیں لوگوں کا کلچر، زبان، تہذیب و تمدن، رہن سہن، کھانا پینا، لباس بلکہ لوگوں کے چہرے اور نقش و نگار بھی بدل جاتے ہیں۔

جہاز میں ایمسٹرڈم سے کافی تعداد میں عرب بھی سوار ہوئے۔ میں نے دیکھا اُن کے نقش و نگار یورپی لوگوں سے مختلف ہیں۔ مردوں کی مونچھیں، گٹھیلے جسم، درمیانہ قد نمایاں تھا۔ لباس اُن کا بھی انگریزی تھا۔ عرب عورتیں بھی انگریزی لباس میں تھیں۔ تاہم اُن کے سر پر سکارف تھا جس سے اُن کے چہرہ کے موٹے نقوش اور صحت مندی اور بھی واضح ہو رہی تھی۔

مجھے یوں محسوس ہوا جیسے عرب قوم کو کھانے میں خالص اور وافر مقدار میں خوراک ملتی ہے۔ اسی طرح میں نے برٹش اور ہالینڈ کے لوگوں کے نقش و نگار میں بھی نمایاں فرق دیکھا۔ ہالینڈ کی عورتیں بھی مجھے کھاتے پیتے گھرانوں کی نظر آئیں۔

یہودی عالم کی تقریر

جہاز میں ایک یہودی عالم بھی سوار تھا۔ اُس نے کالے رنگ کا ایک لمبا چوغا پہنا ہوا تھا۔ سر پر ایک لبوتری سی ٹوپی تھی۔ وہ اپنی سیٹ سے اٹھ اٹھ کر دوسرے مسافروں کے پاس جاتا اور کہتا:

''یہودی دنیا کی پرامن اور شریف قوم ہے۔ ہم نے کبھی بھی کسی قوم پر زیادتی نہیں کی۔ ہمیشہ دوسری قوموں نے ہی یہودیوں کے ساتھ زیادتی کی ہے۔''

میں پوچھنے والا تھا کہ:

''فلسطین میں قتل و غارت کون کر رہا ہے؟''

لیکن اس سے پہلے کہ میں اس سے کچھ کہتا اس ''خرقہ پوش'' نے ایک حسینۂ فرنگ کو جا گھیرا اور میں دل ہی دل میں علامہ اقبال کی زبان میں اللہ سے ''شکوہ'' کرنے لگا۔

قہر تو یہ ہے کہ کافر کو ملیں حور و قصور

اور بے چارے مسلماں سے فقط وعدۂ حور!

ہمارا جہاز ایمسٹرڈم سے اُڑا اور جرمنی، یوگوسلاویہ، ترکی، قبرص سے ہوتا ہوا رات کے سوا گیارہ بجے بیروت کے ہوائی اڈہ پر اُترا۔

بیروت

لبنان کے دارالخلافہ بیروت کے ہوائی اڈہ پر اُترنے سے قبل جہاز نے فضا میں ایک چکر لگایا تو نیچے بحیرہ روم کے کنارے جگ مگ کرتا بیروت کا شہر نظر آیا۔

بیروت ساحل سمندر کے کنارے ایک پہاڑی پر آباد ہے۔ جس کے ایک طرف بحیرۂ روم اور دوسری طرف اسرائیل اور شام کے ملک ہیں۔

بیروت میں ہمارا جہاز ایک گھنٹہ کھڑا رہنے کے بعد دوبارہ سوا بارہ بجے اُڑا۔ جہاز نے جب اُڑان لی تو ہم نے پھر فضا سے اس خوبصورت منظر کو دیکھا جسے ہم نے اُترتے وقت دیکھا تھا۔ پتہ چلتا تھا کہ یہ روشنیوں کا شہر ہے۔ شہر کا عکس سمندر میں بھی دکھائی دیتا تھا۔ جس سے شہر کی خوبصورتی میں اور اضافہ ہو گیا تھا۔

بیروت سے اڑ کر ہمارے جہاز کو دمشق کے ہوائی اڈہ پر اترنا تھا۔ یہ سفر 45 منٹ کا ہے۔ کپتان نے اعلان کیا کہ ہمارا جہاز رات کے ایک بجے شام کے دارالخلافہ دمشق میں اترے گا۔

شام اور دمشق کا نام سنتے ہی میری نظروں کے سامنے تاریخ اسلام کے اوراق کھلنے لگے۔

مجھے سوچیں اس دور میں لے گئیں جب حضور اکرم صلی اللہ وسلم نبوت سے قبل حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کا تجارتی سامان لیکر دو بار شام تشریف لے گئے تھے۔ ایک بار گرمیوں میں دوسری بار سردیوں میں۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ سفر پیدل ہوا کرتا تھا۔ مجھے اس خاک کو دیکھنے اور چھونے کا شوق تھا جہاں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے آج سے چودہ سو سال قبل اپنے قدم مبارک رکھے تھے جہاں بعد میں اسلامی حکومت کا دارالخلافہ منتقل ہوا۔

مذہب کے علاوہ دمشق سے میرا ایک ذاتی رشتہ بھی ہے۔ میرے تایا محمد دین نے انگریزی فوج کے ساتھ پہلی عالمی جنگ میں حصہ لیا تھا۔ 1918ء میں دمشق گئے تھے جہاں وہ کافی عرصہ تک فوج میں خدمات سرانجام دیتے رہے تھے۔

بچپن میں تایا جان دمشق کی باتیں سنایا کرتے تھے۔ ان کی باتیں سن کر جی چاہتا تھا کہ کاش ہمیں بھی دمشق جانے کا موقع ملے اور ہم اس سرزمین کو دیکھیں۔

تایا جان خود تو 1982ء میں کوئی سو سال کی عمر پا کر اللہ کو پیارے ہوئے لیکن بچپن میں انہوں نے جو کہانیاں سنائیں تھیں ان کی تڑپ ابھی تک دل میں موجزن تھی۔

آج میرے بچپن کے سہانے سپنوں کی تعبیر ہونے والی تھی۔ میں خوش تھا، بہت خوش، بالکل اسی طرح جس طرح کسی کو کھویا ہوا بچپن مل جاتا ہے۔ مجھے اپنے بچپن کی باتیں ایک ایک کرکے یاد آ رہی تھیں۔ ہم سب ایک ہی بڑے گھر میں رہتے تھے۔ پڑوس میں تایا

جان کا گھر تھا۔ ہم اکثر تایا جان کے ہاں جاتے تھے۔ وہاں ہی کھاتے، پیتے، سوتے اور رات کو اُن سے کہانیاں سنا کرتے تھے۔

میں یہ سوچ رہا تھا کہ کپتان نے اعلان کیا:

''خواتین و حضرات! ہم چند لمحوں بعد دمشق کے ہوائی اڈہ پر اُترنے والے ہیں۔ حفاظتی بیلٹ باندھ لیجیے۔''

مسافروں نے حکم کی تعمیل کی۔

ایک ہلکا سا جھٹکا لگا اور جہاز دمشق کی سرزمین پر اُتر گیا۔

❁ ❁ ❁
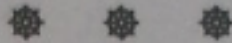
سفر شام

☆ دمشق

☆ حمص

☆ حلب

دمشق

ہم 17 نومبر 1999ء بروز بدھ رات کے ایک بجے دمشق کے ہوائی اڈہ پر اترے۔ جہاز سے باہر نکلے تو عبدالکریم ہمارا انتظار کر رہا تھا۔ کریم دمشق کا رہنے والا ہے اور سیاحت کے لئے آنے والوں کی ویزا سے لیکر ہوٹل کے قیام تک کی ضروریات کا بندوبست کرتا ہے۔

کریم نے ہمارے پاسپورٹ لیے اور امیگریشن کے دفتر میں جا کر پاسپورٹوں پر یوں مہریں لگانے لگا جیسے یہ اسی محکمہ میں کام کرتا ہے۔ بعد میں پتہ چلا کہ اس کا یہاں کافی اثر ورسوخ ہے۔ جلد ہی ہم ہوائی اڈہ کی کارروائی سے فارغ ہو گئے۔ باہر نکلے تو کوچ کھڑی تھی جس نے ہمیں کوئی 45 منٹ کے بعد ''صحرا ٹورسٹ'' نامی ایک فائیو سٹار ہوٹل میں پہنچا دیا' جہاں اگلے چار دن ہمارا قیام رہا۔

دو دو آدمیوں کے حصہ میں ایک ایک کمرہ الاٹ ہوا۔ مجھے حاجی ظہور آرٹسٹ کے ساتھ کمرہ نمبر 404 ملا۔ سونے سے قبل ہم نے ٹیلی ویژن لگایا تو اس وقت چند لڑکیاں ڈسکو ڈانس کر رہی تھیں۔ اسلامی ملک میں یورپی طرز کا ڈانس دیکھا تو ہم چونکے۔ حاجی ظہور صاحب کہنے لگے:

''نظامی صاحب! یہ کیا ہے؟''

میں کیا جواب دیتا۔ خاموشی سے ڈانس دیکھتا رہا اور سوچتا رہا۔

ایک لڑکی جس کی عمر چوبیں پچیس سال سے زیادہ نہیں تھی یورپی طرز کے ایک ایسے لباس میں تھی جس نے اُسے نیم برہنہ کر رکھا تھا۔ لڑکی ہنس مکھ اور دل کھینچ شخصیت کی مالک تھی۔ اس کا پروگرام رومانی تھا۔ اس سے پہلے کہ ذہن میں کوئی فتور پیدا ہوتا، میں نے ٹیلیویژن بند کیا اور لمبی تان کر سو گیا۔

18 نومبر صبح نو بجے فون کی گھنٹی بجی تو دوسری طرف حاجی یونس اویسی صاحب تھے جنہوں نے اپنی نرم، ملائم اور مسکین سی آواز میں کہا:

''نظامی صاحب! صبح ہو چکی ہے۔ اٹھئے اور ڈائننگ ہال میں تشریف لا کر ناشتہ کیجئے۔''

میں نے جی ہاں کہہ کر فون بند کر دیا اور سوچنے لگا: ابھی صبح تین بجے تو میں سویا تھا لیکن ظہور صاحب نے کہا کہ بہتر ہے چلیں کچھ پتہ نہیں آج ہمارا کیا پروگرام ہو۔

میں نرم اور گرم بستر سے اٹھا۔ کمرے کی بالکونی سے باہر جھانکا تو موسم کو انتہائی خوش گوار پایا۔ انگلستان کی سردی اور بارش والی صبح دیکھ کر اکثر طبیعت بگڑ جاتی ہے۔ لیکن یہاں موسم اس کے برعکس تھا۔ دھوپ چمک رہی تھی، ٹمپریچر 25 ڈگری، حد نظر تک جدید سڑکیں اور نئی عمارتیں تعمیر ہو رہی تھیں۔ چھوٹی چھوٹی پہاڑیوں اور ٹیلوں پر مکان بنتے دیکھے۔

بالکل اپنے میرپور کی طرح!

یہ منظر دیکھا تو سفر کی تھکاوٹ جاتی رہی۔

شاور لیا، شیو بنائی اور موسم گرما کے مطابق یعنی پتلون اور ٹی شرٹ پہنی۔ یہ کپڑے پہنتے وقت ڈر رہا تھا کہ کہیں موسم اگلے ہی گھنٹے میں بدل نہ جائے۔ میں نے ظہور سے پوچھا تو انہوں نے کہا: ”نظامی صاحب کمال کرتے ہیں۔ آپ انگلستان میں نہیں بلکہ شام میں ہیں۔“

میں واقعی شام میں تھا۔ انگلستان میں نہیں تھا لیکن کیا کرتا دودھ کا جلا چھاچھ بھی پھونک کر پیتا ہے۔

میں نے دن کے لئے مختصر سامان؛ جس میں میری نوٹ بک اور قلم کے علاوہ کیمرہ تھا؛ لیا اور نیچے ڈائننگ ہال میں پہنچا تو دیکھا حاجی غنی سخت غصہ میں ہیں اور ہوٹل کے خدمت گاروں سے گرم چائے نہ ملنے پر لڑ رہے ہیں۔

ہوٹل کا خدمت گار عربی میں باتیں کر رہا تھا۔ کچھ اس انداز میں جیسے کسی الہامی کتاب کی تلاوت کر رہا ہو اور ہمارے ساتھی حاجی صاحب ٹھیٹ میرپوری میں باتیں کر رہے تھے۔ غصہ میں کبھی سیٹ سے اٹھتے اور کبھی بیٹھتے؛ پھر منہ ہی منہ میں کچھ بڑبڑ کرتے ہوئے خاموش ہو جاتے۔ اچھا خاصا ہنگامہ برپا تھا۔ شور سن کر مینجر آ گیا جس نے مسئلہ حل کیا اور ہمیں گرم گرم چائے پلائی۔

چائے پی رہے تھے کہ ہمارا گائیڈ آ گیا۔

ناشتہ سے فارغ ہو کر ہم کوچ میں جا بیٹھے۔ کوچ انتہائی کشادہ کوئی باون سیٹوں پر مشتمل تھی جب سب ساتھی بیٹھ گئے تو ڈرائیور نے گیئر لگایا اور گاڑی چل پڑی۔

گاڑی کے چلتے ہی گائیڈ کی زبان بھی چلنے لگی:

''میرا نام نادر قصی باقی ہے اور ڈرائیور کا نام محمد ماذن الابرش ہے۔ہم آئندہ چار دن آپ کے ساتھ رہیں گے۔''

گاڑی ہوٹل کے وسیع وعریض ایریا سے نکل کر بڑی شاہراہ پر آئی۔سائن بورڈ پر نظر پڑی ،لکھا تھا:'' بیروت 110 کلومیٹر'' ڈرائیور نے گاڑی بیروت کی بجائے دمشق شہر کی طرف موڑ دی۔اس وقت مجھے محسوس ہوا کہ ہمارا ہوٹل شہر کے وسط میں نہیں بلکہ شہر سے باہر کوئی پندرہ کلومیٹر دور ایک پرفضا مقام پر ہے۔ہم وہاں سے اسی راستے واپس آئے جس راستے رات کو گزرے تھے لیکن رات کو تو مجھے سڑکوں کے کنارے صرف برتن فروخت کرنے والوں کے بڑے بڑے سٹال نظر آئے تھے۔

گاڑی چھوٹی چھوٹی پہاڑیوں اور دروں میں سے گزر رہی تھی۔پہلی بستی ہم نے ایک پہاڑی پر دیکھی جس پر بے ترتیب مکان بنے ہوئے تھے۔گاڑیوں کی بجائے پیدل چلنے والا راستہ تھا۔یہ محلہ دیکھا تو مجھے پاکستان کے بہت سے دیہات یاد آگئے جو اسی طرح بغیر کسی نقشہ کے بنائے جاتے ہیں۔گائیڈ نے بتایا کہ اس پہاڑی پر فلسطین کے مہاجر آباد ہیں۔شام کے صدر حافظ الاسد نے یہ پہاڑی مہاجرین کو رہائش کے لئے مفت دی ہے۔فلسطینی مہاجروں کو اس خستہ حالت میں دیکھا تو بہت دکھ ہوا۔معلوم ہوا کہ یہ مہاجر بڑے محنتی اور جفاکش ہیں جو محنت مزدوری کر کے بچوں کا پیٹ پالتے ہیں۔

راستے میں سڑک کے کنارے ریلوے کی ویران سی پٹڑی دیکھی۔گائیڈ نے بتایا کہ حجاز جانے والی ریل یہاں سے گزرتی ہے۔لیکن یہ تماشہ کبھی کبھی ہوتا ہے۔

تھوڑے عرصہ بعد ہم دمشق شہر پہنچے۔سڑکیں کشادہ' دو طرفہ' گاڑیوں کا ہجوم' ٹریفک لائٹس بھی موجود اور ڈرائیور اس پر عمل بھی کرتے ہیں۔اپنے وطن عزیز کی طرح نہیں کہ ٹریفک لائٹس تو موجود ہوتی ہیں لیکن ڈرائیور ان کو دیکھنا تک پسند نہیں کرتے۔

دمشق کا پرانا شہر

ہماری گاڑی جدید شہر کی جدید عمارتوں اور شاہراہوں سے گزرتے گزرتے بنوامیہ سکوائر جا پہنچی، جہاں سے کویتی ایونیو سے ہوتے ہوئے ریلوے سٹیشن کے قریب سے گذر کر ہم

پرانے شہر میں داخل ہوئے۔ پرانا شہر دیکھا تو مجھے لاہور کا بھاٹی گیٹ اور اس کا گرد و نواح کا علاقہ یاد آیا۔ اسی طرح کے پرانے مکان، تنگ گلیاں، تانگے، ریڑھے، پک اپ گاڑیوں اور سڑک کے کنارے ریڑھیوں پر مختلف چیزیں فروخت ہو رہی تھیں جیسے راولپنڈی کے راجہ بازار میں ہوتی ہیں۔

دمشق کے پرانے شہر کے اردگرد دیوار تھی جو اب بھی خستہ حالت میں موجود ہے۔ پرانے شہر میں داخل ہونے کے لئے سات گیٹ تھے۔ یہ سات گیٹ باب فراج، باب فردوس، باب سلام، باب توما، باب صغیر، باب شرقی اور باب کسن ہیں۔ جن کے نشانات اب بھی موجود ہیں۔

دمشق حضرت عمر خطابؓ کے دور حکومت میں فتح ہوا۔ دمشق پر حملے کا آغاز حضرت ابوبکرؓ کے دور میں اُس وقت سے ہو چکا تھا جب یزید بن ابی سفیان کی قیادت میں اسلامی فوجوں نے شہر کا محاصرہ کیا تھا لیکن کامیابی حاصل نہ ہو سکی تھی۔ حضرت ابوبکرؓ نے شام کو فتح کرنے کے لئے 27000 فوج بھیجی تھی۔ ساری فوج حضرت ابوعبیدہؓ کی قیادت میں تھی۔ لیکن رومیوں نے اجتماعی جنگ کی بجائے چھوٹے چھوٹے گروپوں میں جنگ لڑنی شروع کی تھی جس کی وجہ سے مسلمانوں کے لئے دمشق پر قبضہ کرنا مشکل ہو گیا۔

آخر حضرت ابوبکرؓ نے حضرت خالد بن ولیدؓ کو دمشق جانے کا حکم دیا۔ حضرت خالد بن ولیدؓ ان دنوں عراق کی جنگی مہمات میں مصروف تھے۔ خلیفہ کا حکم ملتے ہی انہوں نے دمشق کا رخ کیا۔ دمشق میں انہوں نے حضرت ابوعبیدہؓ سے مل کر شہر کا محاصرہ کیا۔ اسی دوران حضرت ابوبکر صدیقؓ کا انتقال ہو گیا۔ لیکن حضرت عمر خطابؓ نے اس جنگ کو جاری رکھنے کے احکامات بھیجے۔ چنانچہ دمشق شہر کے ایک طرف حضرت ابوعبیدہؓ اور دوسری طرف خالد بن ولیدؓ کی فوجیں جمع ہو گئیں۔ حضرت خالد بن ولیدؓ کی عادت تھی کہ وہ رات کو جاگتے اور گھومتے رہتے تھے۔

ایک رات جب دمشق کے حاکم کے ہاں بیٹا پیدا ہوا تو اہل شہر نے اس قدر شراب پی کہ سب بدمست ہو کر پڑ رہے۔ حضرت خالد بن ولیدؓ کو علم ہوا تو وہ چند فوجی جوانوں کے ہمراہ دیوار پھلانگ کر شہر میں داخل ہو گئے۔ یوں شہر کا دروازہ کھلا اور اسلامی فوجیں شہر میں داخل ہو گئیں۔ شہر میں شور مچ گیا لوگ شہر کے اس طرف بھاگے جس طرف حضرت ابوعبیدہؓ کی

فوج تھی۔ ابوعبیدہؓ کو ابھی اس بات کا علم نہیں ہوا تھا کہ خالد بن ولیدؓ شہر میں داخل ہو چکے ہیں چنانچہ اہل شہر نے ابوعبیدہؓ کے سامنے ہتھیار ڈال کر ان سے صلح کی درخواست کی جو انہوں نے منظور کر لی۔ یوں دمشق شہر میں ایک طرف سے حضرت خالد بن ولیدؓ فاتح بن کر اور دوسری طرف سے ابوعبیدہؓ مصالحانہ انداز میں داخل ہوئے۔ اس لئے دمشق کی فتح مصالحانہ قرار پائی۔ اس وجہ سے مال غنیمت حاصل کیا گیا اور نہ لونڈیاں بنائی گئیں۔

دمشق 14 ہجری میں فتح ہوا۔

ہم پرانے شہر میں باب فردوس سے داخل ہوئے۔ گاڑی کو بازار میں کھڑا کیا گیا تھا۔ ہمیں کہا گیا کہ ہم جلدی جلدی گاڑی سے اتر جائیں کیونکہ ہماری وجہ سے ٹریفک رک گئی تھی۔

حضرت رقیہؑ کا روضہ

سب سے پہلے ہم حضرت امام حسینؑ کی تین سالہ بیٹی حضرت رقیہؑ کے مزار پر حاضر ہوئے۔ یہ مزار ایک تنگ اور تاریک گلی میں ہے۔ گلی کی نالیاں گندے پانی سے بھری ہوئیں تھیں۔ قدیم بوسیدہ مکانوں اور گلیوں میں سے گزر کر ہم مزار میں داخل ہوئے تو کثیر تعداد میں زائرین کو دیکھا۔ جن کی اکثریت کا تعلق ایران سے تھا۔ مردوں نے جبے پہنے ہوئے تھے اور خواتین نے برقعے لیکن نوجوان لڑکیاں ماڈرن کپڑوں جین، پتلون اور بلاؤز میں تھیں۔ مزار کی حرمت کے پیش نظر انتظامیہ نے مزار میں داخل ہوتے ہوئے گیٹ پر لمبے سیاہ چوغے رکھے ہوئے تھے جو ان لڑکیوں کو پہنائے جاتے تھے۔ یوں سب لوگ باادب اندر داخل ہوتے۔ ہم بھی مزار پر گئے اور دعا مانگی۔

ہمارے ساتھی الحاج یونس اویسی صاحب کی قیادت میں جب مزار پر کھڑے ہو کر سلام پڑھ رہے تھے تو اس وقت میں قریب ہی دو رکعت نماز نفل پڑھ رہا تھا۔ میں نماز سے اور میرے ساتھی سلام پڑھنے سے فارغ ہوئے تو ہم سب گائیڈ کی قیادت میں تنگ و تاریک گلیوں میں گھومتے پھرتے پرانے شہر کے مرکز میں واقع مسجد امیہ جا پہنچے۔

سلطان صلاح الدین ایوبی کا مزار

ہم مسجد امیہ کے قریب پہنچے تو گلی میں ایک بورڈ نظر آیا جس پر لکھا تھا "صلاح الدین ایوبی"۔ صلاح الدین ایوبی کا نام پڑھا تو مجھے یاد آیا کہ بچپن میں ہم نے کتابوں میں پڑھا تھا

کہ یورپ کے عیسائی بچے جب روتے تو مائیں انہیں چپ کرانے کے لئے کہا کرتی تھیں:

"بیٹے چپ ہو جاؤ! صلاح الدین آ رہا ہے۔"

اور صلاح الدین کا نام سن کر روتے بچے چپ ہو جاتے۔

میں اس عظیم سپہ سالار کے دربار پر حاضر ہوا جس کے خلاف پورے یورپ کے عیسائی اور فرانس، اٹلی، جرمنی، ناروے، ڈنمارک، سسلی، انگلستان کی حکومتیں اور ہر ملک کے چرچ اور امراء آپس کے تمام اختلافات بھلا کر جنگ کے لئے نکلے تھے۔ انگلستان کے بادشاہ رچرڈ نے، جسے بہادری کی بنا پر شیر دل کہا جاتا تھا، نے اپنے عوام سے صلاح الدین کے نام سے ایک ٹیکس لینا شروع کیا تھا جس کی ادائیگی ہر ایک پر لازم تھی۔

صلاح الدین نے عیسائیوں کی نیندیں حرام کر رکھی تھیں۔

رچرڈ عیسائی فوج کی قیادت خود کر رہا تھا۔ لیکن یورپ کے تمام ملکوں کی اتحادی فوجوں کو صلاح الدین نے ناکوں چنے چبوائے۔ صلاح الدین کی تلوار نے چھ لاکھ عیسائیوں کو موت کے گھاٹ اتارا۔ آج جب میں اس عظیم سپہ سالار کے دربار میں حاضر ہوا تو مجھے اپنی قسمت پر ناز تھا۔

3 مارچ 1193ء کو سلطان صلاح الدین نے وفات پائی۔ شیخ ضیاء الدین ابو قاسم عبدالمالک نے غسل دیا اور عصر کے وقت قلعہ دمشق میں اُنہیں دفن کر دیا گیا۔ پہلو میں ان کی وہ تلوار رکھ دی گئی جو پوری عمر ان کی کمر کے ساتھ رہی تھی۔ تین سال بعد سلطان کے بیٹے نے میت کو موجودہ جگہ دفن کیا۔

صلاح الدین ایوبی کا مزار مسجد امیہ کے پہلو میں اُسی طرح واقع ہے جس طرح بادشاہی مسجد لاہور کے پہلو میں علامہ اقبال کا مزار ہے۔ مزار کے صحن میں ایک خوبصورت باغیچہ ہے۔ باغیچہ لیمن اور سنگتروں کے درختوں سے بھرا ہوا ہے۔ میں سلطان صلاح الدین ایوبی کے مقبرہ کے اندر گیا تو دیر تک صلیبی جنگوں کے تصورات ذہن کے پردہ پر آتے رہے۔ وہ وقت یاد آیا جب سلطان نے بیت المقدس کو عیسائیوں کے قبضہ سے آزاد کروایا۔ جب میرا ذہن اس کام میں مصروف تھا تو آنکھیں اس عظیم سپہ سالار کو تحسین پیش کرتے ہوئے برسات کی رم جھم برسا رہی تھیں۔ تھوڑا سنبھلا تو اپنے اردگرد کا جائزہ لیا۔

حاجی کرامت حسین زار و قطار رو رہے ہیں۔ ممکن ہے انہیں بھی صلیبی جنگوں کی تاریخ

اور اسلام کو بچانے والی وہ شخصیت یاد آ گئی ہو، جس کی آج امت مسلمہ کو اشد ضرورت ہے۔

میں نے مقبرے کے اندر گھوم کر جائزہ لیا تو مجھے دو قبریں نظر آئیں۔ گائیڈ سے اس کی وجہ پوچھی تو اس نے بتایا کہ: ''جب جرمنی کا بادشاہ ولیم دوم 1889ء میں دمشق آیا تو وہ صلاح الدین کے مزار پر بھی حاضر ہوا اس نے اپنی طرف سے سلطان کے لئے سنگ مرمر کی قبر کا تحفہ دیا۔ جو اصل قبر کے بالکل ساتھ رکھ دی گئی ہے۔''

ہم کافی عرصہ مقبرے کے اندر اور اس کے باہر احاطے میں گھومتے رہے۔ مقبرے کے بالکل سامنے وہ مدرسہ ہے جو سلطان کے بھائی نے قائم کیا تھا۔ مجھے اس جگہ ایک خاص سکون محسوس ہوا۔

اسی سکون کی حالت میں، میں کافی عرصہ باہر خاموش بیٹھا رہا۔ پھر حاجی رشید صاحب میرے پاس آئے، انہوں نے مجھے اٹھایا اور میں اپنے ساتھیوں کے ساتھ مسجد امیہ کی طرف چل پڑا۔

مسجد امیہ

مسجد امیہ سلطان صلاح الدین ایوبی کے مزار کے بالکل ساتھ ہے۔ ہم مزار سے نکلے تو عظیم مسجد کے اندر داخل ہو گئے جو اُموی حکمرانوں کی جیتی جاگتی نشانی ہے۔ مدینہ منورہ کے بعد دمشق اسلامی ریاست کا دارالخلافہ بنا۔ اسلامی دارالخلافہ کے شان شایان ایک کشادہ اور خوبصورت مسجد کی ضرورت تھی۔ یہ مسجد اسی ضرورت کے پیش نظر تعمیر کی گئی تھی جو اس وقت بھی دنیا کی بڑی مسجدوں میں شمار ہوتی ہے۔

مسجد میں داخل ہونے کے لئے تین بڑے دروازے ہیں جو باب برید، باب امراء اور باب جیرون ہیں۔ ہم باب برید سے مسجد میں داخل ہوئے تو سامنے بہت ہی وسیع و عریض کورٹ یارڈ دیکھا۔ میں نے درودیوار کا جائزہ لیا تو مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میں کسی قلعہ میں داخل ہو گیا۔ یہ سچ بھی ہے!

اسلام کے ابتدائی دور میں مسجدیں حکومتی مراکز ہوا کرتی تھی۔ صحن میں ایک گنبد نما چیز دیکھی۔ قریب گیا تو اس پر لکھا ہوا تھا: ''بیت المال''۔

میں نے گائیڈ سے پوچھا کہ یہ کیا چیز ہے؟

اس نے بتایا کہ سلطان افضل ابن صلاح نے یہ بنوائی تھی تا کہ شہری اپنی قیمتی اشیاء اس میں رکھ سکیں گویا یہ بیت المال والا گنبد موجودہ دور کے لاکر کی سروس فراہم کرتا تھا۔ مسجد کے کورٹ یارڈ یعنی صحن کا رقبہ 612 میٹر ہے۔

مسجد کے صحن کے درمیان بڑے بڑے فوارے ہیں اور ان کے گرد ایک تالاب ہے جو اس وقت خشک تھا۔ پرانے وقتوں میں لوگ یہاں وضو کیا کرتے تھے۔ میں نے مسجد کے اوپر سامنے دیوار پر دیکھا تو مجھے عقاب کی طرح پر پھیلائے ایک اور شے نظر آئی لوگ اسے "ایگل ڈوم" کہتے ہیں۔ اس پر خوبصورت بیل بوٹوں، محلات اور مختلف مناظر کی رنگین تصاویر ہیں۔ گائیڈ نے بتایا کہ یہ منظر جنت کا ہے۔

صحن سے گزر کر ہم بڑے دروازے سے مسجد کے اس حصہ میں داخل ہوئے جہاں نماز ادا کی جاتی ہے۔ یہ جگہ بھی بہت ہی وسیع ہے۔ حد نظر تک یہاں قالین ہی قالین نظر آئے۔ ہم نے نماز ظہر اسی مسجد میں ادا کی۔

جب میں مسجد کو گھوم پھر کر دیکھ رہا تھا، مجھے کچھ گوری چٹی جوان لڑکیاں نظر آئیں جنہوں نے خاکی لمبے لباس پہنے ہوئے تھے اور اپنے گائیڈ کے ساتھ مسجد کو دیکھ رہی تھیں۔ میں نے ایک پیار سے پوچھ ہی لیا کہ آپ کون ہیں اور کہاں سے تشریف لائی ہیں۔

لڑکی مغربی انداز میں مسکرائی اور بولی: "ہم راہبہ ہیں اور فرانس سے یہاں سیر اور تربیتی کورس کے لیے آئی ہیں۔"

میں نے پوچھا کہ مسجد میں آپ کا کیا کام؟

لڑکی نے بتایا کہ:

"یہاں مسجد کی جگہ ہمارا چرچ ہوا کرتا تھا۔ آپ کے خلیفہ ولید بن عبدالملک نے 705ء میں یہاں مسجد بنوانی شروع کی تو عیسائی پادریوں کو اس جگہ کے عوض شہر میں چار خوبصورت چرچ بنا کر دیئے تھے۔ اب اگرچہ یہ مسجد ہے لیکن اس مسجد کی بنیادیں تو ہماری چرچ پر ہی ہیں ہم اسی مناسبت سے اسے دیکھ رہی ہیں۔"

پھر ایک مزار کی طرف اشارہ کر کے کہنے لگی کہ نبی یوحنا (حضرت یحییٰ علیہ السلام)

جن کا یہ مزار ہے، وہ بھی تو ہمارے ہی تھے۔

میں کہنے والا تھا کہ وہ ہمارے بھی ہیں لیکن مجھے اس خدشہ نے گھیر لیا کہ حسین لڑکیوں سے بحث نہیں کرنی چاہئے کیونکہ اس میں خطرۂ ایمان کا احتمال ہے۔

جاتے جاتے لڑکی نے مجھے تبلیغ کی دعوت دی لیکن میں نے اُسے ٹال دیا۔ میں اس لڑکی کے ساتھ جانے کی بجائے اس طرف چل پڑا جدھر حضرت یحییٰ علیہ السلام کا مقام تھا۔

حضرت یحییٰ علیہ السلام نبی اللہ کا مقام

حضرت یحییٰ علیہ السلام جنہیں عیسائی یوحنا کہتے ہیں، حضرت عیسیٰؑ روح اللہ سے چھ ماہ بڑے تھے ان کا یہ مقام یہاں مسجد امیہ میں محراب سے تھوڑے فاصلے پر بائیں طرف ہے۔ مزار پر حاضری دی۔ یہاں رش نہیں تھا۔ قبر کے اردگرد جالیاں ہیں۔

قبر زمین سے تقریباً آٹھ فٹ اونچی ہے۔ جس پر چادریں ڈالی ہوئی ہیں سر کی طرف قبر کے اوپر ایک سبز رنگ کی پگڑی تھی۔ اندر شیلف پر قرآن پاک کا ایک نسخہ رکھا تھا۔ مزار کے اوپر چرچ کی پرانی گھنٹیاں نظر آئیں۔ میں نے دیکھا کہ مزار کی جالیوں کے ساتھ بے شمار تالے اور کپڑے بندھے ہوئے ہیں میرے خیال میں منت مراد پوری ہو جانے کے بعد بعض لوگ انہیں نذر نیاز کے طور پر پیش کرتے ہونگے۔

حضرت یحییٰ علیہ السلام اللہ کے نبی تھے جنہیں ہیرود نامی ایک یہودی رومی بادشاہ نے اپنی محبوبہ کی فرمائش پر قتل کرنے کا حکم دیا تھا۔ اس بادشاہ نے اپنے بھائی فلپ کی بیوی کو اپنے گھر میں ڈال رکھا تھا۔ حضرت یحییٰ علیہ السلام نبی اللہ اس طرح کی بداخلاقیوں کے خلاف آواز بلند کرتے تھے۔ عورت جو بادشاہ کی رکھیل تھی حضرت یحییٰ علیہ السلام کے خلاف ہوگئی۔ کہتے ہیں بادشاہ کی سالگرہ کا جشن تھا کہ بادشاہ کی اس محبوبہ کی بیٹی نے کمال کا رقص کیا۔ جس پر بادشاہ نے خوش ہوکر پوچھا: مانگ کیا مانگتی ہے؟

لڑکی نے ماں سے مشورہ کیا۔ چنانچہ لڑکی نے ماں کے کہنے پر حضرت یحییٰ علیہ السلام نبی اللہ کا سر مانگا۔ بادشاہ گھبرایا لیکن زبان دے چکا تھا۔ حکم دیا کہ یحییٰ کا سر پیش کیا جائے۔ چنانچہ حکم کی تعمیل میں حضرت یحییٰ علیہ السلام کا سر ایک تھال میں رکھ کر پیش کر دیا گیا۔

روایت ہے کہ جب خلیفہ ولید نے اس مسجد کی تعمیر شروع کروائی تو زید ابن وقاص

نامی ایک آفیسر کو کام کا نگران مقرر کیا۔

دوران تعمیر زید کو تہہ خانے میں پتھر کی ایک ٹوکری میں رکھا ہوا ایک سر ملا اور اس کے ساتھ ایک تحریر تھی کہ یہ حضرت یحییٰ علیہ السلام نبی اللہ کا سر ہے۔

اب خلیفہ وقت نے حکم جاری کیا اسی جگہ ایک پر وقار مزار بنایا جائے۔ اس طرح یہاں حضرت یحییٰ علیہ السلام کا مقبرہ بنا دیا گیا۔ حضرت یحییٰ علیہ السلام کی جو قبر گائیڈ بتلاتے ہیں اس میں صرف حضرت یحییٰ علیہ السلام کا سر ہے۔ جسم کا باقی حصہ نجانے کہاں ہے؟

حافظ کا چھا

چوروں پر مور کا محاورہ تو میں نے سن رکھا تھا لیکن اس کا عملی مظاہرہ یہاں مسجد امیہ میں دیکھا۔ مزار کے باہر بغیر داڑھی کے کچھ صحت مند ادھیڑ عمر کے بینائی سے محروم لوگ ایک دوسرے سے کچھ فاصلے پر بیٹھے ہوئے تھے۔ لوگ آتے، ان میں سے کسی کے سامنے دو زانو ہو کر بیٹھتے اور انہیں نذرانہ پیش کرتے۔ حافظ صاحبان اسے ٹٹول کر دیکھتے تھے۔ اگر مال ٹھیک ملا تو پھر سائل کے زانو پر زور زور سے ہاتھ مارتے، اس کے جسم پر کچھ پڑھ کر پھونکتے اور جسم پر ہاتھ پھیر کر زور زور سے دباتے۔

حاجی غنی نے ایک حافظ صاحب کو پانچ پونڈ کا نوٹ دیا۔ ایک گداگر لڑکا قریب کھڑا تھا۔ اُس نے یہ نوٹ اُن سے لے لیا اور اُس کے بدلے میں کم مالیت کا ایک شامی لیرا دے کر بھاگ گیا۔

حاجی غنی بھاگے کہ یہ پیسے تو میں نے حافظ صاحب کو دیئے ہیں۔ انہوں نے دور جا کر اس سے پانچ پونڈ چھین لیے۔ اب لڑکا اس بات پر بضد تھا کہ اس نے جو پیسے شامی کرنسی میں حافظ کو دیئے ہیں، وہ واپس کیے جائیں۔ لیکن ''حافظ کا چھا'' مشہور ہے۔ وہاں سے پیسے واپس لینے مشکل تھے۔ وہ لڑکا پونڈوں کے لالچ میں اپنے پیسوں سے بھی محروم ہوا۔

مجھے یہ حافظ جعلی نظر آئے جو حضرت یحییٰ علیہ السلام کے نام سے ناجائز فائدہ اٹھا رہے تھے۔

حضرت امام حسینؓ کا سر مبارک اور حضرت زینبؓ کا قید خانہ

مسجد کے ایک حصہ میں حضرت امام حسین علیہ السلام کا سر مبارک دفن ہے۔ جب

گائیڈ نے ہمیں وہ حصہ دکھایا تو اندر داخل ہوتے وقت دیوار میں ایک طاق نما جگہ دیکھی جس کے بارے میں روایت ہے کہ یہاں حضرت امام حسینؑ کا سر مبارک رکھا گیا تھا۔ اس کے ساتھ ایک چھوٹا سا کمرہ تھا جہاں حضرت زینبؑ کو قیدی بنا کر رکھا گیا تھا۔ ہمارے ایک ساتھی نے بتایا کہ اسی طرح کا ایک مقام اس نے مصر میں بھی دیکھا تھا جسے مسجد امام حسین کہتے ہیں اور وہاں بھی ایک قبر میں حضرت امام حسینؑ کے سر مبارک کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ دفن ہے۔

مؤرخ کہتے ہیں کہ واقعہ کربلا کے بعد سنان بن انس نے حضرت امام حسینؑ کا سر مبارک تن سے الگ کر کے قافلہ آل رسول کے ساتھ دمشق میں یزید کے پاس بھیجا تھا۔ میرا ذاتی قیاس ہے کہ امام حسینؑ کا سر مبارک دمشق میں دفن ہے۔ چونکہ اس وقت اسلامی دنیا کا دارالخلافہ دمشق تھا جہاں یزید رہتا تھا۔

جہاں تک مسجد امیہ میں قید خانے اور سر مبارک کے دفن ہونے والی بات ہے اس بارے میں مجھے کچھ شبہ ہے۔ واقعہ کربلا 61 ہجری بمطابق 681 عیسوی کو ہوا تھا۔ اور یہ مسجد اس واقعہ کے چوبیس سال بعد ولید بن عبدالملک نے 705ء میں تعمیر کروانی شروع کی جو نو سال بعد یعنی 714ء کو مکمل ہوئی تھی۔

تاریخی مسجد امیہ کی سیر کرتے کرتے دن کے دو بج چکے تھے۔ بھوک بھی تنگ کرنے لگی تھی۔ ہم گائیڈ کے ساتھ اسی کوچ میں اسی راستے سے واپس سفر کرتے ہوئے ہوٹل پہنچے۔ دوپہر کا کھانا کھایا۔ جو ابلے چاولوں اور کباب پر مشتمل تھا چاولوں کے ساتھ کوئی سالن نہیں ملا تو ہمارے حاجی غنی نے صبح کی طرح پھر ہنگامہ بپا کر دیا۔ انہوں نے بہت شور مچایا۔ لیکن اب کے ان کی کسی نے پرواہ نہ کی۔

کھانے کے بعد ساتھی آرام کرنے اپنے کمروں میں چلے گئے۔ میں ہوٹل کے کیفے ٹیریا میں بیٹھے عربوں کے ساتھ جا شامل ہوا۔

کویت کے سیاحوں سے ملاقات

ہوٹل کے کیفے ٹیریا میں مجھے کویت کے ان سیاحوں سے ملنے کا موقع ملا جو

زیارتوں کے لئے دمشق آئے تھے۔ میں ایک کرسی پر بیٹھا ہی تھا کہ ایک کویتی نے میرے قریب آ کر کہا: ''آپ کی شکل پاکستان کے ایک کرکٹر سے ملتی ہے۔''

سوچا کہ کہہ دوں کہ میں وہی ہوں پھر سوچا یہاں آ کر بھی سچ نہ بولا تو پھر کہاں بولوں گا۔ میں نے سچ بول کر اس کے خیال کی تردید کی۔ بہرحال اس سے ہماری بات چیت کا آغاز ہو گیا۔ جب انہیں پتہ چلا کہ میں برطانیہ میں مقیم ہوں تو ایک موٹے تازے کویتی نے پوچھا کہ انگلینڈ میں کیا تمام پاکستانی مزدوری کرتے ہیں۔ میں نے بتایا کہ ہمارے لوگ کاروبار، تعلیم اور سیاست میں بھی بڑا نام کما رہے ہیں۔ اور ہمارا ایک مسلمان ممبر آف پارلیمنٹ بھی ہے تو اس نے بڑے طنزیہ لہجے میں کہا: ''یہ تو کوئی بات نہ ہوئی۔'' چھ سو ممبران پارلیمنٹ میں صرف ایک پاکستانی۔

جب میں نے یہ پوچھا کہ کویت کی پارلیمنٹ کے کل کتنے ممبر ہیں اور ان میں کویتی کتنے ہیں۔ تو پہلے تو وہ آئیں بائیں اور شائیں کرنے لگا، پھر ہنسنے لگا اور میرا دوست بن گیا۔

کویت میں بادشاہت ہے وہاں جمہوریت اور پارلیمنٹ کی وقعت کیا؟

جب انہیں یہ پتہ چلا کہ میں عراق جا رہا ہوں اور لکھنے پڑھنے سے دلچسپی رکھتا ہوں۔ تو اُن میں سے ایک نے کہا: ''جب آپ عراق جائیں تو عراقی بھائیوں کو ہمارا سلام کہیے گا۔ وہ ہمارے بھائی اور رشتہ دار ہیں۔ ہمیں ان کے ساتھ ہمدردی ہے۔ ہمیں اگر اختلاف ہے تو صرف اُن کی حکومت سے ہے۔ حکومت ہمارے چھ سو قیدیوں کو رہا کر دے تو ہماری ان سے کوئی لڑائی نہیں۔ صلح ہی صلح ہے۔ ان چھ سو میں سے کچھ ایسے قیدی بھی ہیں جن کے بچوں نے بھی انہیں نہیں دیکھا۔''

عراق پہنچ کر جب میں نے یہ باتیں عراق کے لوگوں سے کہیں تو انہوں نے یہ ماننے سے انکار کر دیا کہ اُن کے پاس کوئی کویتی قیدی ہے۔ انہوں نے کہا: ''یہ کویت والوں کا پروپگنڈا ہے تاکہ اس بہانے امریکہ ہمارے سروں پر بیٹھا رہے۔''

نبی اللہ حضرت ہابیل علیہ السلام

تین بجے ہم حضرت آدم علیہ السلام کے بیٹے ہابیل علیہ السلام کا مزار دیکھنے گئے۔

حضرت آدم علیہ السلام کے دو بیٹوں حضرت ہابیل اور قابیل کے درمیان لڑائی ہوئی تھی قابیل نے غصہ میں آ کر ہابیل کو قتل کر دیا تھا اور یوں دنیا میں پہلا قتل ہوا۔

ہابیل کی قبر دمشق شہر سے تقریباً چالیس کلو میٹر دور ایک ویران پہاڑی پر ہے۔ راستے میں پہاڑیاں ہیں، ٹیلے ہیں اور ویرانیاں ہی ویرانیاں ہیں۔ کچھ لوگوں کو دور دور بھیڑ بکریاں چراتے دیکھا۔ راستے میں دیماس نامی ایک گاؤں آیا جس کی آبادی پانچ ہزار افراد پر مشتمل ہے۔ دو پہاڑیوں کے درمیان اس خوبصورت گاؤں میں دو خوبصورت مسجدیں بھی ہیں۔ ہم یہ سفر اسی سڑک پر کر رہے تھے جو دمشق سے بیروت جاتی ہے۔

دیماس گاؤں کے بعد کچھ فاصلہ تو ہم نے بڑی سڑک پر طے کیا۔ لیکن پھر گاڑی بڑی سڑک سے اتر کر ایک تنگ اور قدرے کچی سڑک پر چلنے لگی۔ جس کا رخ ایک پہاڑی کی طرف تھا۔ جب پہاڑی کے نصف میں پہنچے تو وہاں آرمی کی چیک پوسٹ تھی۔ جنہوں نے گاڑی روک لی اور مطالبہ کیا کہ پاسپورٹ دکھاؤ۔ ہمارے پاسپورٹ تو ہوٹل میں تھے۔ گائیڈ نے انہیں کافی سمجھایا کہ یہ ولایت سے یہاں آئے ہیں لیکن وہ بالکل نہ مانے۔ آخر حاجی کرامت حسین نے اپنی جیبیں ٹٹولنی شروع کیں تو انہیں اپنا ایک پرانا پاسپورٹ ملا جسے فوجیوں نے پاس رکھا اور ہمیں جانے کی اجازت ملی۔

چیک پوسٹ سے تھوڑے فاصلہ پر گاڑی ایک پہاڑی کے اوپر جا کر رکی۔ اسی پہاڑی پر ایک مزار دیکھا جس پر گنبد تھا۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے ابھی کچھ برس قبل ہی کسی نے اس منصوبہ کو مکمل کیا ہے۔ اور یہاں حضرت ہابیل کی قبر دریافت کی گئی ہے۔ ورنہ حضرت آدم علیہ السلام کا دور تو اتنا پرانا ہے کہ صحیح تاریخ کے بارے میں مورخ بھی بتانے سے قاصر ہیں۔

میں نے دنیا کی سب سے پرانی قبر کو نئے اور تازہ مزار کی شکل میں دیکھا۔ یہ ایک عام سی عمارت تھی جس کے ایک کمرے میں ایک بہت لمبی قبر تھی۔ میں نے اس سے قبل اتنی لمبی قبر نہیں دیکھی تھی۔ قبر کی پیمائش کی تو وہ 17 فٹ نکلی۔ قبر دیکھی تو مجھے اپنے علاقے کے وہ نوگزے مزار یاد آئے جہاں مرادیں مانگی جاتی ہیں۔ سوچنے لگا کہ سترہ فٹ یعنی پانچ گز دو فٹ قد تو حضرت آدم علیہ السلام کے بیٹے کا تھا یہ نوگز یعنی ستائیس فٹ کی مخلوق کا شجرۂ نسب کس سے ملتا ہے؟

اب شام ہو چکی تھی اندھیرا چھا رہا تھا۔ مزار میں روشنی کا کوئی معقول انتظام نہیں تھا۔ ہم پاکستانی زائرین کے علاوہ کچھ ایرانی خواتین اور مرد بھی وہاں تھے۔ میں نے محسوس کیا کہ وہاں ایران کے لوگ زیادہ جاتے ہیں۔ مزار کے صحن میں ایک درخت تھا جس پر ایک کاغذ چسپاں تھا، کاغذ پر تحریر تھی:

''زائرین محترم از چیدن برگ شفا است''

یعنی اس درخت کے پتوں میں شفا ہے۔ ایک موٹا مشٹنڈا مجاور زائرین کے اردگرد گدھ کی طرح منڈلا رہا تھا اور ساتھ ساتھ اس درخت کے پتے فروخت کرتا تھا۔ اس نے مجھے بھی پتے کھانے کی دعوت دی لیکن میں نے یہ کہہ کر اس کی پیش کش مسترد کر دی کہ: ''میرا تعلق ہریالی کھانے والی مخلوق سے نہیں''۔

یوں بھی یہ حیوانوں کے حقوق پر ڈاکہ ڈالنے والی بات ہے۔ مجھے اس مزار کے محل وقوع کے بارے میں کچھ شک ہوا۔ میرے خیال کے مطابق حضرت آدم علیہ السلام اور اماں حوا جب اس دنیا میں اترے تو یقیناً وہ شام میں نہیں آئے تھے۔ زیادہ قیاس جدہ کا ہے۔ اہل فلسطین کے خیال میں قابیل نے ہابیل کو اعبرہ نامی ایک مقام پر قتل کیا تھا۔ یہ جگہ بیت المقدس کے قریب بتائی جاتی ہے۔

ہمارے کچھ ساتھی ہابیل کی قبر سے واپسی پر باتیں کرنے لگے کہ حضرت آدم علیہ السلام کے بیٹے قابیل نے اپنے بھائی ہابیل کو اس لئے قتل کیا تھا کہ دونوں بھائی اپنی بہن سے شادی کرنا چاہتے تھے۔ چنانچہ لڑائی ہوئی اور دنیا میں پہلا قتل عورت کی وجہ سے ہوا۔ مجھے یہ سن کر حیرانگی ہوئی۔ کیونکہ قرآن پاک اس پہلے قتل کے بارے میں کچھ اور بتاتا ہے۔

قرآن پاک پارہ 6 سورۃ المائدہ کے رکوع 7 میں حضرت آدم کے دو بیٹوں کا قصہ اس طرح بیان ہوا ہے:

''اور ذرا انہیں آدم کے دو بیٹوں کا قصہ بھی بے کم و کاست سنا دو۔
جب ان دونوں نے قربانی کی تو ان میں سے ایک کی قربانی قبول کی گئی
اور دوسرے کی نہ کی گئی۔ اس نے کہا'' میں تجھے مار ڈالوں گا۔'' اس
نے جواب دیا: '' اللہ تو متقیوں ہی کی نذریں قبول کرتا ہے۔ اگر تو مجھے

قتل کرنے کے لیے ہاتھ اٹھائے گا تو میں تجھے قتل کرنے کے لیے ہاتھ نہ اٹھاؤں گا۔ میں اللہ رب العالمین سے ڈرتا ہوں۔ میں چاہتا ہوں کہ میرا اور اپنا گناہ تو ہی سمیٹ لے اور دوزخی بن کر رہے۔ ظالموں کے ظلم کا یہی ٹھیک بدلہ ہے" آخر کار اس کے نفس نے اپنے بھائی کا قتل اس کے لیے آسان کر دیا اور وہ اسے مار کر ان لوگوں میں شامل ہو گیا جو نقصان اٹھانے والے ہیں۔ پھر اللہ نے ایک کوا بھیجا جو زمین کھودنے لگا تاکہ اسے بتائے کہ اپنے بھائی کی لاش کیسے چھپائے۔ یہ دیکھ کر وہ بولا افسوس مجھ پر! میں اس کوے جیسا بھی نہ ہو سکا کہ اپنے بھائی کی لاش چھپانے کی تدبیر نکال لیتا۔ اس کے بعد وہ اپنے کیے پر بہت پچھتایا۔"

ایک شامی گاؤں

حضرت ہابیل کے مزار سے واپسی پر نماز مغرب ایک دیہات میں ادا کی۔ یہ گاؤں دمشق سے تقریباً بیس میل دور ہے۔ ہم نے سڑک کے کنارے گاڑی کھڑی کی اور نماز پڑھنے مسجد میں گئے۔ جماعت ہو چکی تھی۔ نمازی بھی گھروں کو جا چکے تھے صرف نوجوان امام مسجد کے باہر کھڑا کسی سے باتیں کر رہا تھا۔

نماز کے بعد حاجی کرامت حسین نے اہلیان بریڈفورڈ کی طرف سے امام صاحب کو مسجد کیلئے کچھ پیسے دیے۔ امام صاحب نے پیسے وصول کیے اور پوچھا: "یہ پیسے آپ مسجد کے کس کام کے لئے دینا چاہتے ہیں۔" اگر آپ کی خواہش کسی خاص کام کے لئے ہو تو ہم انہیں اسی کام کے لئے خرچ کریں گے۔ یہ سن کر مجھے خوشی ہوئی اور اطمینان ہوا کہ یہ امام صاحب ان پیسوں کو مسجد پر ہی خرچ کریں گے۔

دمشق کا دامن کوہ

شام چھ بجے ہم دمشق کے دامن کوہ، جسے قاسیون کہا جاتا ہے، دیکھنے گئے۔ وہاں پہنچے تو مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میں پاکستان کے دارالحکومت اسلام آباد کے دامنِ کوہ میں آ گیا

ہوں۔ اسلام آباد کی طرح شام کے دارالخلافہ دمشق کی پشت پر بھی پہاڑی ہے۔ یہاں سے دمشق شہرات کی روشنی میں جگ مگ کرتا نظر آرہا تھا بالکل اسلام آباد کی طرح۔ مسجدوں کے اونچے مینار جن میں سبز روشنیاں جلتی تھیں دور سے بتاتے تھے کہ یہ اللہ کے گھر ہیں۔ یہاں سے شہر کا جغرافیائی منظر سمجھنے میں کافی مدد ملی۔

ہم کافی عرصہ یہاں چہل قدمی کرتے رہے۔ ہمارے ساتھیوں نے ریڑھیوں سے بادام اور خشک فروٹ خریدا۔ یہ ریڑھیاں پک اپ گاڑیوں کی صورت میں تھیں۔ پک اپ گاڑیوں کے پچھلے حصہ میں تختے لگا کر ان پر اشیاء برائے فروخت رکھی ہوئی تھیں۔ ان امیر ریڑھابانوں کو دیکھ کر جی بہت خوش ہوا۔

قاسیون سے شہر کا نظارہ کرنے کے بعد ہم دمشق شہر دیکھنے گئے اور گھومتے پھرتے رات سات بجے ہوٹل پہنچے جہاں وہی دوپہر والے سفید چاول اور کبابوں پر مشتمل کھانا ملا۔ اس کھانے سے ہمارے ساتھیوں کی اکثریت خوش نہیں تھی لیکن بے چارے مجبور تھے۔ کیا کرتے!

قبرستان اہل بیعت

19 نومبر بروز جمعہ صبح دس بجے ہم قبرستان اہل بیت کی زیارت کو پہنچے۔ موسم خوشگوار تھا۔ نومبر کے مہینے میں ٹی شرٹ پہن رکھی تھی اور سورج کی تپش سے ہلکا ہلکا پسینہ آرہا تھا۔ یہ قبرستان پرانے شہر کے باب صغیر کے باہر واقع ہے اسی نسبت سے اسے قبرستان باب صغیر بھی کہتے ہیں۔ اس قبرستان میں بڑی بڑی عظیم ہستیاں آرام فرما رہی ہیں۔ اکثر قبریں پختہ ہیں جن پر اسی طرح سنگ مرمر کی تختیاں نصب ہیں جس طرح ہمارے ملک میں نصب ہوتی ہیں۔ ہم نے زیارتوں کا آغاز حضرت صفیہؓ کے مزار سے کیا۔

حضرت صفیہؓ زوجہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

حضرت صفیہؓ کا مزار قبرستان کے جنوبی حصہ میں سڑک کے بالکل قریب ہے۔
سڑک والی طرف بورڈ آویزاں ہے جس پر تحریر ہے:

"حضرت صفیہؓ زوجہ رسول اللہ صلی اللہ"

ہم گیٹ سے داخل ہوئے تو تھوڑے فاصلہ پر تقریباً آٹھ فٹ چوڑی اور دس فٹ

ایک چھوٹی سی کوٹھی نظر آئی۔ وہاں کوئی آدمی موجود نہیں تھا ہم نے دروازہ کھولا اور مزار کے اندر گئے۔ قبر عربوں کی روایت کے مطابق زمین سے تقریباً چھ فٹ اونچی تھی۔ اس پر سبز چادریں پڑی تھیں۔ معلوم ہوتا تھا۔ جیسے یہاں عرصہ سے کسی نے جھاڑو نہیں دیا۔

حضرت صفیہؓ 7 ہجری میں فتح خیبر کے بعد حضورﷺ کی زوجیت میں آئیں۔ حضرت صفیہؓ کے والد خیبر کے رئیس تھے اور جنگ خیبر میں مارے گئے تھے۔ حضرت صفیہؓ جنگی قیدی بن کر آئیں تو مدینہ آ کر حضور اکرمﷺ نے انہیں آزاد کر کے ان سے نکاح فرمایا۔

حضرت صفیہؓ کے مزار کی زیارت کے بعد ہم اسی قبرستان کے شمال کی جانب چل پڑے۔

حضرت بلالؓ

قبرستان کے شمالی حصہ میں داخل ہوئے تو دائیں طرف ایک مزار پر لکھا تھا:

"سیدنا بلال بن رباح الحبشی رضی اللہ عنہ"

ہم دروازہ سے داخل ہوئے تو تین چار سیڑھیاں اُترنے کے بعد تقریباً سولہ فٹ چوڑے اور اتنے ہی لمبے کمرے میں حضرت بلالؓ کی قبر ہے۔ قبر زمین سے تقریباً پانچ فٹ اونچی تھی۔ اور اس پر سبز چادریں تھیں۔

حضرت بلالؓ مکہ کے ایک سردار امیہ بن خلف کے غلام تھے۔ اُن کا وطن حبشہ تھا۔ اس نسبت سے انہیں بلال حبشی بھی کہا جاتا تھا۔ حضرت بلال نے اسلام قبول کیا تو امیہ نے انہیں سخت اذیتیں دیں۔ وہ کبھی انہیں تپتی دھوپ میں لٹا کر اُن کے اوپر پتھر رکھ دیتا اور بعض اوقات گلے میں رسی ڈال کر گلی محلے کے لڑکوں سے کہتا کہ اسے کھینچو اور شریر بچے انہیں گلیوں میں کھینچتے پھرتے۔ انہیں دہکتے انگاروں پر لٹایا جاتا، ان کے زخموں سے نکلنے والی رطوبت سے آگ بجھ جاتی لیکن ظالم ترس نہ کھاتے۔ حضرت بلالؓ یہ تمام اذیتیں برداشت کرتے رہے لیکن اسلام کا دامن نہ چھوڑا۔ اور پھر اسلام نے انہیں وہ عزت دی جو کسی اور کو نصیب نہ ہوئی۔ انہیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی قربت نصیب ہوئی اور اسلام کا پہلا موذن ہونے کا شرف ملا۔

حضرت بلالؓ کے ساتھ اسی کمرہ میں حضرت زینبؓ کے خاوند عبداللہ بن جعفر طیارؓ کے علاوہ سات دوسری قبریں بھی ہیں۔ ایران سے آنے والے زائرین کے امام نے حضرت عبداللہ کے مزار پر کھڑے ہوکر فارسی میں ایک مختصر تقریر کی جس پر لوگ رونے لگے۔ فارسی نہ جاننے کی وجہ سے میں کچھ نہ سمجھ سکا۔

حضرت عبداللہ کے والد جعفر طیارؓ ان صحابہ میں شامل تھے جنہوں نے کفار مکہ کے ظلم سے تنگ آکر حبشہ ہجرت کی تھی۔ کفار مکہ نے جب اپنا ایک وفد شاہ نجاشی کے پاس اس درخواست کے ساتھ بھیجا کہ وہ مسلمان مہاجرین کو واپس بھیج دے۔ نجاشی بادشاہ نے مہاجرین کو دربار میں طلب کیا۔ اس وقت حضرت جعفر طیارؓ نے مہاجرین کی طرف سے بات کی تھی اور اسلام کی تعلیمات پیش کی تھیں۔

حضرت بلال حبشیؓ کے مزار سے نکلے تو حضرت اسماءؓ کے مزار پر پہنچے۔ حضرت اسماءؓ حضرت جعفر طیارؓ کی زوجہ تھیں۔ قبرستان کے اس حصہ میں میمونہ دختر امام حسن، فاطمہ صغریٰ دختر امام حسین، حضرت ام کلثوم دختر حضرت علیؓ کے علاوہ موذن رسول ﷺ حضرت عبداللہ بن مکتومؓ کی قبریں بھی ہیں۔ حضرت عبداللہ بن مکتومؓ نابینا تھے۔ قرآن پاک کے پارہ تیس کی سورۃ عبس کے آغاز میں جس اندھے آدمی کے ساتھ حضور صلی اللہ وسلم کا بے رخی برتنے کا اشارہ ہے وہ حضرت عبداللہ بن مکتومؓ ہی ہیں۔ جو حضرت خدیجہؓ کے پھوپھی زاد بھائی تھے۔

حضرت امیر معاویہؓ کا مزار

مجھے کاتب وحی حضرت امیر معاویہؓ کی قبر کی تلاش تھی۔ گائیڈ سے پوچھا تو اس نے بتایا کہ وہ تو موجود نہیں ہے۔ میں نے بعض دوسرے افراد سے بھی پوچھا لیکن سب کا جواب نفی میں تھا۔ آخر بڑی تلاش کے بعد مجھے وہ آدمی مل ہی گیا جسے اس قبر کا پتہ تھا۔ وہ آدمی تھا یاسین نامی مجاور جو اس قبرستان کی نگرانی پر مامور تھا۔ میں نے ترجمان کے ذریعے اس سے حضرت امیر معاویہؓ کی قبر کے بارے میں پوچھا تو اس نے اِدھر اُدھر دیکھا اور پھر رازدارانہ لہجہ میں معاوضہ لیکر قبر دکھانے کی حامی بھری اور ساتھ تاکید کی کہ یہ بات صیغہ راز میں ہی رہے۔ میں

نے اُسے معاوضہ دیا اور اُس کی رہنمائی میں حضرت معاویہؓ کی قبر پر پہنچا۔ حاجی کرامت حسین، ظہور پیٹر اور حاجی رحمان بھی میرے ساتھ تھے۔

یاسین مجاور ہمیں اُسی قبرستان کے ایک کنارے لے گیا اور ایک کونے میں ایک کچی کوٹھڑی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا:

''یہ ہے حضرت امیر معاویہؓ کی قبر۔''

میں سوچنے لگا کہ کیا واقعی یہ امیر معاویہ کی قبر ہے؟

کتابوں میں پڑھا تھا کہ عباسی دور میں بنی امیہ کی قبریں کھول کر ان کی ہڈیاں بھی قبروں سے نکال کر جلادی گئی تھیں۔ اگر یہ بات سچ ہے تو پھر...... یہ قبر کہاں سے آ گئی!

ہم قبر والی کوٹھڑی کے اندر گئے۔ قبر کو انتہائی خستہ حالت میں پایا۔ کمرہ جو کچی مٹی کا تھا کی ایک طرف کی دیوار بھی گری ہوئی تھی۔

کمرے کے اندر ایک گڑھا تھا جس کے بیچ قبر ہے۔ میں گڑھے سے نیچے اتر کر قبر کے پاس گیا۔ تو وہاں مٹی کے ایک ڈھیر کے سوا کچھ نظر نہ آیا۔ جس کے اردگرد خالی ڈبے اور مختلف قسم کا کوڑا کرکٹ پڑا تھا۔ میں اُسے قبر سمجھ کر بیٹھ گیا۔ فاتحہ خوانی کی اور اپنے دماغ میں امڈ آنے والے طرح طرح کے خیالات سے الجھتا ہوا باہر آ گیا۔

حضرت سلمیٰؓ اور حضرت ام حبیبہؓ

قبرستان اہل بیت میں حضور اکرم ﷺ کی زوجین حضرت سلمیٰ اور حضرت ام حبیبہؓ کے مزار بھی ہیں۔ یہ دونوں مزار ساتھ ساتھ ہیں۔ قبریں زمین سے کوئی پانچ فٹ اونچی ہیں ام حبیبہؓ کی قبر کے اردگرد شیشہ ہے۔ روضہ کے باہر ایک بورڈ پر لکھا ہوا تھا: ''ام حبیبہ زوجہ سیدنا رسول ﷺ'' دوسرے بورڈ پر تحریر تھا ''ام سلمیٰؓ زوجہ سیدنا رسول ﷺ''

ان دونوں مزاروں کی حالت بہتر ہے یہاں صفائی کا انتظام بھی اچھا ہے۔

شہدائے کربلا

ہمیں بتایا گیا۔ کہ حضرت سلمیٰؓ اور حضرت ام حبیبہؓ کے مقبروں کے سامنے سڑک کے اس پار شہدائے کربلا کے سر مبارک دفن ہیں۔ معلوم ہوتا تھا جیسے یہ مزار ابھی حال ہی میں

ازسرنو تعمیر کیا گیا ہے۔ مزار ایک کشادہ کمرے کے درمیان جالیوں میں ہے۔اس کے اوپر
چھوٹی چھوٹی سبز ٹوپیاں رکھی ہیں جن پر شہدائے کربلا کے نام لکھے ہوئے ہیں۔
روضہ پر اہل تشیع حضرات کا ہجوم تھا۔اس روضے کے ساتھ حضرت زین العابدین
کے بیٹے السید محمد سلیم رضا مرتضیٰ کا مزار بھی ہے۔ یہ مزار انتہائی خوبصورت اور کشادہ ہے۔
روشنی کا بھی اعلیٰ انتظام ہے۔
قبرستان اہل بیت کی زیارت کے بعد ہم کوچ میں بیٹھ کر حضرت زینبؑ کے روضہ کی
جانب روانہ ہوئے۔

حضرت زینبؑ کا روضہ

حضرت زینبؑ کا روضہ دمشق شہر سے کوئی پندرہ کلومیٹر دور زینب نامی گاؤں میں
ہے، ہمارا قافلہ نماز جمعہ کے وقت وہاں پہنچا۔سب سے پہلے ہم نے روضہ سے ملحق مسجد میں
نماز ادا کی۔محراب کے دائیں امام خمینی اور بائیں ایران کے موجودہ صدر سید محمد خاتمی کی بڑی
بڑی قد آدم تصویریں تھیں۔نماز پڑھنے کا طریقہ بھی ذرا مختلف تھا۔نماز پڑھ کر باہر نکلے تو
ہمارے کچھ سنی بھائیوں نے نماز دوبارہ پڑھنے کا فیصلہ کیا۔چونکہ ان کے بقول ان کی یہ نماز
قبول نہیں ہوئی تھی۔

میں نے بہر حال نماز پڑھ لی تھی اس لئے میں حضرت زینبؑ کے روضہ پر حاضری
دینے چلا گیا۔ روضہ ایک خاصی کشادہ جگہ میں واقع ہے۔اس کے دونوں طرف بڑی بڑی
مسجدیں ہیں۔ دائیں طرف کی مسجد اہل تشیع کے لئے اور بائیں طرف کی مسجد اہل سنت کے
لئے ہے۔ دونوں مسجدوں کے درمیان کھلی جگہ ہے۔ان دونوں کے عین درمیان میں روضہ
ہے۔روضہ فانوس کی روشنی میں جگ مگ کرتا، انتہائی خوبصورت منظر پیش کرتا ہے۔دیواروں
اور گنبد پر شیشہ ہی شیشہ ہے جو فانوس کی روشنوں کو منعکس کرتے ہوئے اور زیادہ خوبصورت
لگتا ہے۔

میرے خیال میں مقبرے کا ہال چالیس گز لمبا اور چالیس گز چوڑا ہوگا جس کے
ایک طرف عورتوں اور دوسری طرف مردوں کے لئے جگہ ہے۔عین مرکز میں قبر ہے جس کے

اردگرد خوبصورت جالی ہے۔ اگر کوئی نذرانہ دینا چاہے تو کرنسی کی صورت میں اندر پھینک سکتا ہے۔ قبر سنہری ہے اور زمین سے تقریباً آٹھ فٹ اونچی ہے۔ سر کے اوپر تاج رکھا ہوا ہے۔ جالی کے ساتھ لوگوں نے تالے اور رنگ رنگ کے کپڑے باندھ رکھے تھے۔

واقعہ کربلا کے بعد خاندان آل رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی قیادت حضرت زینبؑ کے ہاتھ آئی تھی اور انہوں نے بڑے تحمل، بردباری، جرات اور فراست سے اپنے بچے کھچے قافلے کی قیادت کی تھی اور ان کے حوصلے بلند رکھے تھے۔

سانحہ کربلا حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نواسی، حضرت علیؑ شیر خدا اور حضرت فاطمہؑ خاتون جنت کی بیٹی کی آنکھوں کے سامنے پیش آیا تھا۔ ان کے بھائی حضرت امام حسینؑ اور خاندان کے دوسرے تمام جوان اور بچے ان کی آنکھوں کے سامنے شہید ہوئے تھے۔ لیکن اس عظیم خاتون نے کربلا سے دمشق تک قیدی کی حیثیت سے اپنے بھائی حضرت امام حسینؑ کا سر مبارک نیزے پر دیکھتے ہوئے جس انداز میں سفر کیا اور پھر یزید کے دربار میں جس طرح خطاب کیا وہ ایک تاریخی حیثیت رکھتا ہے۔ ورنہ گھرانے کے ایک فرد کی وفات پر بڑے سے بڑا آدمی بھی حواس باختہ ہو جاتا ہے۔

ہم تک واقعہ کربلا کے جو حالات پہنچے ہیں ان کی واحد چشم دید گواہ حضرت زینبؑ تھیں اگر وہ بھی شہید کر دی جاتیں تو پھر اس عظیم سانحہ پر رہتی دنیا تک پردہ پڑا رہتا۔ حضرت زینبؑ کے اس سانحہ کے بارے میں جگہ جگہ خطاب نے اس واقعہ کو دنیائے اسلام میں پھیلایا۔

زیارت کے بعد میں ایک کونے میں خاموشی سے بیٹھ کر یہ سوچنے لگا کہ یہ مزار شہر سے اتنا دور کیوں ہے؟

حالانکہ اہل بیت کا قبرستان شہر میں ہے۔ سوچا ممکن ہے واقعہ کربلا کے بعد حضرت زینبؑ نے دنیا سے کنارہ کشی اختیار کر کے اس گاؤں میں رہائش اختیار کر لی ہو۔

میں اس طرح کی سوچوں میں منہمک تھا کہ میری ملاقات محسن نقوی سے ہوئی۔ جو ملھووالی ضلع اٹک کا رہنے والے ہیں اور مقامی زینبیہ یونیورسٹی میں طالب علم ہیں۔ محسن نے بتایا کہ یہ مزار شہر سے باہر اس لئے ہے کہ یہ جگہ حضرت زینبؑ کے سسر جعفر بن طیارؓ کی تھی جنہوں نے یہ زمین اپنے بیٹے حضرت عبداللہؓ کو دے دی تھی جو حضرت زینبؑ کے خاوند تھے۔

جب اہل بیت کا قافلہ یزیدی فوجوں کے ساتھ کربلا سے دمشق آ رہا تھا تو حضرت امام حسینؑ کے سر مبارک کو یہاں ایک درخت کے ساتھ باندھ دیا گیا تھا۔ حضرت زینبؑ نے بعد میں اسی جگہ رہنا پسند کیا۔

محسن نقوی نے بتایا کہ یہاں دو یونیورسٹیاں ہیں امام خمینی یونیورسٹی اور زینبیہ یونیورسٹی۔ ان یونیورسٹیوں میں فقہ جعفریہ کی تعلیم دی جاتی ہے۔ یہ جگہ آج سے بیس سال پہلے تک ویران تھی لیکن اب کچھ برسوں سے یہاں جنگل میں منگل ہو گیا ہے۔

میں نے گھوم پھر کر سارے علاقہ کو دیکھا۔ مین گیٹ کے پاس کچھ آدمی ان خواتین اور نوجوان لڑکیوں کو برقعہ نما لمبے چوغے دے رہے تھے جو یورپی لباس میں تھیں۔ واپس جاتے وقت وہ خواتین لباس واپس کر دیتی تھیں اور کچھ نذرانہ بھی دے دیتیں۔

ہمارا قافلہ تقریباً تین بجے واپس سٹی سینٹر گیا جہاں مطعم الکمال نام کے ایک ریستوران میں دوپہر کا کھانا کھایا۔ ریستوران انتہائی خوبصورت تھا اور جدید ترین سہولتوں سے آراستہ تھا۔ گاہکوں کی کثرت تھی۔ ہمیں دوسری منزل پر لے جایا گیا۔ دمشق میں پہلی بار سب سے اچھا کھانا کھانے کو ملا۔ جس میں عربوں کی روایات کے مطابق شوربہ، مختلف قسموں کے سلاد، چٹنیاں، پلاؤ، روٹیاں، روسٹ گوشت اور طرح طرح کے لوازمات تھے۔

چلتے وقت فروٹ پیش کیا گیا۔ جو ہم نے گاڑی میں رکھوا لیا۔ کھانا بہت لذیذ تھا اس لئے سب نے پیٹ بھر کر کھایا۔

ابن العربی کا مزار

کھانے کے بعد ہم دمشق کے نواحی گاؤں صلاحیہ گئے۔ یہ گاؤں پھیلتا پھیلتا اب شہر کا حصہ بن چکا ہے۔ گاؤں کی آبادی سات ہزار افراد پر مشتمل ہے۔ مکان کچے، گلیاں تنگ اور صفائی کا کوئی خاص انتظام نہیں تھا۔ دکانیں پاکستان کی دیہاتی دکانوں کی مانند تھیں اور گلی محلے کے بچے ننگے پھرتے وطن کی یاد تازہ کرتے نظر آئے۔ گاؤں ڈھلوان پر ہے۔ بس یہی سمجھئے کہ قاسیون کا پہاڑی سلسلہ اس دربار سے ہی شروع ہوتا ہے۔ مزار تک سڑک نہیں جاتی اس لئے گاڑی دور کھڑی کر کے مزار تک پیدل گئے۔

جب ہم مزار پر پہنچے تو ایک خادم نے آگے بڑھ کر ہم سب پر عطر لگانا شروع کر دیا۔ مجھے اس میں خلوص کم اور بناوٹ زیادہ نظر آئی۔ خیر میں دائیں مڑ کر سیڑھیاں اتر کر ایک تہہ خانے میں گیا جہاں ''ابن العربی'' کی قبر ہے۔

ابن العربی کا اصل نام محی الدین ہے۔ وہ سپین میں پیدا ہوئے تھے انہوں نے فلسفہ اور شاعری میں بہت نام کمایا۔ علمی پیاس بجھانے دمشق آئے اور پھر اس گاؤں میں مقیم ہو گئے۔ اپنے وقت کے مشہور فلسفی اور شاعر کی قبر آج کل ایک ایسے دربار کی سی شکل اختیار کر چکی ہے جہاں مرادیں مانگی جاتی ہیں اور چڑھاوے چڑھائے جاتے ہیں۔ ابن عربی کی قبر کے ساتھ انکے دو بیٹوں کی قبریں ہیں۔ یہاں ایک قبر الجزائر کے لیڈر امیر عبدالقادر الجزائری کی بھی تھی جسے اب الجزائر منتقل کر دیا گیا ہے۔ تہہ خانے میں کل سات قبریں ہیں۔

فاتحہ خوانی کے بعد مسجد میں داخل ہوا تو مسجد کے دائیں کونے میں ہمارا قافلہ دو بزرگوں کے درمیان بیٹھا ہوا تھا۔ دونوں بزرگ بغیر داڑھی کے تھے اور دعا مانگنے میں مصروف تھے۔ ایک صاحب اپنے ہاتھ کچھ ضرورت سے زیادہ اونچے کر کے دعائیں مانگ رہے تھے۔ میں بھی جا کر دعا میں شامل ہو گیا۔ جب دعا ختم ہوئی تو ان صاحب نے دوبارہ دعا مانگنی شروع کر دی۔ یہ سلسلہ اسی طرح چلتا رہا۔ ایک دعا ختم ہوتی تو دوسری شروع ہو جاتی۔ میں تھک کر قریب رکھی ہوئی ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ ایک اور صاحب نے اٹھنے کی کوشش کی تو پیچھے کھڑے مجاوروں نے انہیں اٹھنے سے روک دیا۔ اسی طرح دعاؤں کا سلسلہ کوئی پون گھنٹہ چلتا رہا۔ آخر حاجی غنی نے تنگ آ کر اپنے ساتھیوں سے کہا کہ ''انا کی کج دیو تے جان چھوڑن'' یعنی انہیں کچھ دو تب جان چھوڑیں گے۔

ساتھیوں نے حاجی غنی کی بات پر عمل کیا کچھ پیسے دیئے تو جان چھوٹی۔

دعا کے بعد ہمارا قافلہ مزار پر فاتح خوانی کے لئے چلا گیا اور میں ان دعا مانگنے والوں کا جائزہ لیتا رہا۔ دونوں نے نوٹوں کی گنتی کی اور نصف نصف جیبوں میں ڈال کر باہر نئے گاہکوں کا شکار کرنے جا بیٹھے۔

ان سے جان چھوٹی تو مانگنے والوں نے آ گھیرا۔ وہاں ایک اللہ لوک قسم کا آدمی گھوم رہا تھا۔ جس کا کسی جسمانی بیماری کی وجہ سے پیٹ پھولا ہوا تھا اور بولنے اور سننے سے

محروم تھا۔ ایسے اللہ لوگ پاکستان کے بازاروں اور بعض درباروں پر عام نظر آتے ہیں لیکن حاجی غنی نے جب اس جدی و پشتی عرب کو دیکھا تو اسے "اللہ کا بندہ" اور "کامل ولی" قرار دیتے ہوئے اس کے ہاتھ پاؤں کو بوسے دیئے، انتہائی عقیدت کا اظہار کیا، کچھ پیسے دیئے اور مجھ سے کہہ کر اُس کے ساتھ اپنا فوٹو بھی بنوایا۔ پھر اس سے خصوصی دعا کیلئے کہا۔ لیکن بے چارے کو کچھ پتہ ہی ہوتا تو دعا مانگتا۔ حاجی غنی اس کامل ولی کی دعاؤں سے محروم رہے۔

بازار کی سیر

دن بھر زیارتوں میں مصروف رہنے کے بعد فیصلہ ہوا کہ دین کے ساتھ ساتھ کچھ دنیا کا رونق میلہ بھی دیکھا جائے۔ چنانچہ شام کے وقت ہماری گاڑی باب توما کے پاس آ کر کھڑی ہوگئی۔ باب توما پرانے شہر کے سات دروازوں میں سے ایک ہے۔ یہ اس وقت بھی بڑی شان سے اپنی پرانی جگہ کھڑا ہے۔ ہمیں دو گھنٹے دیئے گئے کہ بازار گھوم پھر کر خریداری کریں۔ میں باب توما کے سامنے والے بازار میں اکیلا ہی چلا گیا۔ اصل میں مجھے شوق تھا کہ شاپنگ کے ساتھ یہاں کے رہنے والوں کی زندگی کے رنگ ڈھنگ ذرا قریب سے دیکھوں۔

سارا شہر جگ مگ کر رہا تھا۔ بازار کو نئی نسل نے زیادہ رونق بخشی ہوئی تھی۔ وہ انگریزی لباس میں اپنے ساتھیوں کے گلے میں بانہیں ڈالے دنیا جہاں سے بے نیاز گھوم رہے تھے۔ اگر موسم خوشگوار نہ ہوتا تو میں یہی سمجھتا کہ برطانیہ یا فرانس کے کسی فیشن ایبل علاقہ میں گھوم رہا ہوں۔ لڑکے اور لڑکیاں جین اور کھلے گلے کی قمیضوں میں اپنی مست جوانیوں کا مظاہرہ کر رہے تھے۔ لڑکیوں کی اکثریت کے بال کٹے ہوئے اور سنہری رنگ میں رنگے ہوئے تھے۔ لوگوں کی رنگت سفید ہے۔ چنانچہ سفید چمڑی پر سنہرے بال دیکھ کر یہی محسوس ہوتا کہ میں یورپ میں ہوں۔ اکثر دکانیں پرفیوم اور فیشن سے بھری پڑی تھیں۔

میں ایک گفٹ شاپ میں گیا تاکہ بیگم اور بچوں کے لئے کچھ خریداری کروں۔ دکان میں زبان کا مسئلہ پیدا ہو گیا۔ وہاں ایک نوجوان جوڑا خریداری میں مصروف تھا۔ جب مجھے انگریزی اور دکاندار کو عربی بولتے دیکھا تو لڑکی نے لپک کر ہمارے لئے ترجمانی کے فرائض انجام دینے شروع کر دیئے۔ میں نے یہاں سے کچھ تحفے خریدے اور جاتے وقت

لڑکی کا شکریہ ادا کیا۔

جاتے جاتے لڑکی نے پوچھ لیا کہ میں کس دیس کا باسی ہوں۔ جب میں نے برطانیہ کا نام لیا تو لڑکی کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ اُس نے اپنے ساتھی سے عربی میں کچھ کہا اور پھر مجھے دعوت دی کہ میں ان کے ساتھ قریب ہی ایک کیفے ٹیریا میں چل کر چائے پیوں۔ مجھے کیا چاہئے تھا چائے اور وہ بھی ایک خوبصورت جوڑے کی دعوت پر۔ چنانچہ ہم کیفے ٹیریا گئے جہاں چائے کے ساتھ مٹھائی بھی تھی۔ اتنی لذیذ مٹھائی میں نے زندگی میں اس سے پہلے کبھی نہیں کھائی تھی۔

ممکن ہے مٹھائی میں اُس عرب لڑکی کی میٹھی گفتگو کا بھی کچھ اثر ہو گیا ہو۔ لڑکے کو انگریزی نہیں آتی تھی۔ اس لئے لڑکی ہی باتیں کرتی رہی۔ لڑکی نے بتایا کہ دمشق میں میڈیکل، انجینئرنگ اور عام علوم کی الگ الگ یونیورسٹیاں ہیں۔ اس شہر میں 13 فیصد عیسائی اور 87 فیصد مسلمان رہتے ہیں۔ لوگوں کا ذریعہ معاش سیاحت اور زراعت ہے۔ کچھ فیکٹریاں بھی ہیں۔ ٹورازم میں بڑا پیسہ ہے لیکن حکومت مذہبی زیارتوں کو پرکشش بنانے پر توجہ نہیں دیتی۔ میں نے لڑکی سے کہا کہ آپ کے صدر حافظ الاسد ماشاء اللہ قرآن پاک کے حافظ اور نیک کار آدمی نظر آتے ہیں۔ یہ اس طرف توجہ کیوں نہیں دیتے!

یہ سن کر لڑکی نے ہنسنا شروع کر دیا اور اس قدر بے ساختہ ہنسی کہ مجھے محسوس ہوا جیسے میں نے کوئی غلط بات کہہ دی ہو۔ ہنستے ہنستے جب وہ رکی تو اس نے کہا:

"جناب! کیا قرآن کے حافظ بڑی بڑی شاہراہوں، سڑکوں اور عوامی جگہوں پر اپنے فوٹو لگا کر زبردستی ہر دلعزیز بنا کرتے ہیں۔"

پھر اُس نے کہا: جناب یہ حافظ القرآن نہیں ہیں۔ حافظ ان کا نام ہے۔ اور وہ مسلک کے لحاظ سے علوی ہیں جو اہل تشیع کی ایک قسم ہے۔

لڑکی نے مجھ سے پوچھا: "آپ یہ سفر کس مقصد کیلئے کر رہے ہیں؟"

میں نے کہا: "زیارتوں کیلئے۔"

لڑکی نے مشورہ دیا: "تو پھر ذرا احتیاط کیجئے گا۔ یہاں کاروباری لوگوں نے بہت سے جعلی مزار بنائے ہوئے ہیں۔"

میں نے حیران ہو کر پوچھا: ''بھلا مزار بھی جعلی ہو سکتے ہیں؟''

لڑکی نے جواب دیا: ''بالکل ہو سکتے ہیں۔ بلکہ ہیں۔''

میں نے کہا: ''کیا یہاں عرب میں بھی ایسا ہوتا ہے؟''

لڑکی نے کہا: ''جی ہاں اور پھر شرارت کے لہجہ میں مجھ سے پوچھا پاکستانی اور بھارتی مسلمان عربوں کو فرشتہ کیوں سمجھتے ہیں؟''

میں نے کہا: ''آپ سے محبت اور عقیدت کی وجہ سے ہے۔''

لڑکی نے ہنستے ہوئے اپنی طرف اشارہ کیا: ''میرے ساتھ محبت''

میں نے کہا: ''آپ سے نہیں بلکہ آپ کے آباؤ اجداد کے ساتھ۔''

لڑکی نے کہا: ''میں اور میرے آباؤ اجداد ——— ایک ہی بات ہوئی ناں''

میں تو جواب میں اقبال کا یہ شعر پڑھنے والا تھا کہ:

تھے تو آبا وہ تمہارے ہی، مگر تم کیا ہو؟

ہاتھ پہ ہاتھ دھرے منتظر فردا ہو!

لیکن پھر سوچا کہ:

زبان یار من ترکی و من ترکی نمی دانم

آہستہ آہستہ گفتگو میں بے تکلفی آ گئی تو لڑکی بولی: ''میرا نام لیلیٰ الکندی ہے۔ میں مقامی یونیورسٹی میں ایم اے فلاسفی کی طالبہ ہوں۔''

یہ کہہ کر لڑکی اٹھی اور ماڈل گرل کی طرح اپنے لباس کی نمائش کر کے مجھ سے پوچھنے لگی: ''کیا میں انگریز لڑکیوں کی طرح نظر آتی ہوں۔'' جب میں نے مسکراتے ہوئے اثبات میں سر ہلایا تو لڑکی خوشی کے مارے چہکنے لگی۔

یہ دیکھا تو لڑکی کے بوائے فرینڈ نے مجھے گھورنا شروع کر دیا۔ تو مجھے یاد آیا کہ یہ دمشق ہے جہاں کے عاشق محبوبہ کی فرمائش پر پیغمبروں کے سر کاٹ کر تھال میں پیش کر دیتے ہیں۔

عقل نے مشورہ دیا کہ بہتری اسی میں ہے کہ یہاں سے فوری بھاگو۔ میں نے عقل کی سنی اور بھاگنے میں ہی اپنی عافیت سمجھی۔

جان کی امان پائی تو ساتھیوں کی تلاش شروع کر دی۔ شہر میں مجھے گائیڈ مل گیا جو مجھے تلاش کر رہا تھا۔ مجھے دیکھا تو خوش ہوا اور کہا: "ہم نے سمجھا تھا کہ آپ کھو گئے ہیں" میں نے کہا: "ہاں کھو گیا تھا لیکن حضرت یحییٰ علیہ السلام کا سر قلم ہونے والا واقعہ یاد آ گیا اس لئے ڈر کے مارے اپنے ٹھکانے پر آ گیا ہوں!"

دمشق سے حلب کا سفر

20 نومبر 1999ء بروز ہفتہ صبح آٹھ بجے ہمارا قافلہ حلب کے لئے روانہ ہوا۔ دمشق شہر تو میدانی علاقے پر مشتمل ہے لیکن شہر کی پشت پر پہاڑی سلسلہ ہے۔ ہمارے سفر کا آغاز پہاڑیوں کے بیچوں بیچ ہوا۔ یہ پہاڑیاں ویران اور پتھریلی ہیں۔ اور ان میں ریت کی آمیزش زیادہ ہے بلکہ یہ کہنا زیادہ مناسب ہے کہ یہ ریت کی پہاڑیاں ہیں۔ کہیں کہیں دور کوئی بھیڑ بکریاں چراتا نظر آ جاتا تو احساس ہوتا۔ کہ غالباً قریب ہی کوئی آبادی بھی ہوگی۔

اس ویرانے اور صحرا میں ایک انتہائی کشادہ اور خوبصورت سڑک پہاڑیوں کے درمیان سانپ کی طرح بل کھاتی حلب کی طرف جا رہی تھی۔ ہمارے دائیں ہاتھ صحرا تھا جبکہ بائیں ہاتھ پہاڑی سلسلہ جو بحیرہ روم تک پھیلا ہوا تھا۔ یوں محسوس ہوتا جیسے گاڑی آہستہ آہستہ بلندی کی طرف جا رہی ہے۔ لیکن یہ پہاڑی سلسلہ بڑے بڑے اونچے پہاڑوں پر مشتمل نہیں بلکہ چھوٹے چھوٹے ٹیلوں اور نچلی سطح کی پہاڑیوں پر مشتمل تھا۔

سڑک کے کنارے ہم نے دور قدیم کے مسافر خانے دیکھے جو عثمانیوں نے تعمیر کیے تھے۔ مسافر خانوں میں سواری کے لئے استعمال ہونے والے گھوڑوں اور اونٹوں کے کھانے پینے کا بھی انتظام ہوا کرتا تھا۔ دمشق سے پچاس کلو میٹر دور پہنچے تو محسوس ہوا کہ ہم پہاڑی کے اوپر پہنچ گئے ہیں۔ گائیڈ نے اعلان کیا کہ اس پہاڑی پر موسم سرما میں برف گرتی ہے۔ پھر بائیں جانب پہاڑوں کی طرف اشارہ کیا کہ یہاں سے دس کلو میٹر دور مالولہ **Maalula** گاؤں ہے۔ جس کے بائیں طرف لبنان کی پہاڑیاں ہیں۔

مالولہ گاؤں

مالولہ شام کا سب سے پرانا گاؤں ہے۔ جب رومیوں نے شام کو فتح کیا تو عیسائی

عقیدے کے لوگ رومیوں کے خوف سے پہاڑوں میں چھپ گئے۔ کچھ لوگ مالولہ کے گاؤں میں ایسے چھپے کہ دو ہزار سال کے لگ بھگ ہونے کو ہیں اور وہ اب بھی انہی پہاڑی غاروں میں رہتے ہیں۔ کتنے ظالم تھے رومی!

غاروں میں رہنے والے لوگ عربی کی بجائے آرمیک زبان بولتے ہیں جو سب سے پرانی زبان ہے۔ ان لوگوں کی بود و باش دو ہزار سال پرانی ہے۔ لوگوں کی اکثریت عیسائی ہے۔ کچھ لوگ حلقہ اسلام میں بھی داخل ہوئے ہیں۔ اب آہستہ آہستہ لوگ غاروں سے نکل کر قریب کی پہاڑیوں پر مکان تعمیر کر رہے ہیں۔ لیکن اکثریت اب بھی غاروں میں رہتی ہے۔ یہ غاریں دو پہاڑوں کے بیچوں بیچ واقع ہیں اس لئے دفاع کے لئے محفوظ ترین ہیں۔

مالولہ گاؤں سے ذرا آگے گئے تو سڑک کے بائیں طرف جولان یا گولان کا پہاڑی سلسلہ شروع ہو گیا۔ گائیڈ نے بتایا کہ یہاں سے ستر کلومیٹر دور جولان کی پہاڑیاں ہیں جو کبھی شام کی ملکیت ہوا کرتی تھیں 1967ء کی عرب اسرائیل جنگ کے دوران اسرائیل نے ان پر قبضہ کر لیا۔ اس پہاڑی سلسلہ کو اہل شام جبل شیخ، آل ہرامون اور آل قالمون کے ناموں سے پکارتے ہیں۔

شام میں میرپور

جبل شیخ کے بعد آہستہ آہستہ میدانی علاقہ شروع ہو گیا۔ لیکن صحرا کا غلبہ رہا۔ سفر کرتے ہوئے ہم النبک نامی قصبہ میں پہنچے تو گائیڈ نے بتایا کہ اس قصبے کی اکثریت بیرون ملک مقیم ہے۔ وہاں وہ محنت مزدوری کرتے ہیں۔ لیکن اپنے وطن عزیز کو نہیں بھولتے۔ حکومت نے ان لوگوں کو یہ جگہ دی تاکہ وہ اپنے لئے جدید شہر تعمیر کر سکیں۔ النبک کو دیکھا تو میرپور یاد آیا جس کے باسی بھی انگلستان اور دنیا کے دوسرے ممالک میں مقیم ہیں دن رات محنت کر کے پیسے جمع کر کے بلاگالہ کی پہاڑی پر جدید ترین پلازے بنا رہے ہیں۔ النبک کے پلازے، شاپنگ سینٹر، سکول کالج، ہسپتال، بنک، پٹرول پمپ اور ریستوران تمام میرپور سے ملتے جلتے تھے۔ شہر کو پانی فراہم کرنے کے لئے اونچے اونچے واٹر ٹینک بھی نظر آئے۔

النبک کے بعد زمین آہستہ آہستہ ہموار ہونی شروع ہوئی اور کچھ کچھ فاصلوں پر انسانی زندگی کے آثار بھی نظر آنے لگے۔ ٹھیک ساڑھے دس بجے صوبائی دارالخلافہ حمص پہنچے۔

حمص کو شام میں مرکزی حیثیت حاصل ہے۔اس کے ایک طرف بحیرہ روم اور دوسری طرف صحرا ہے جبکہ تیسری طرف دمشق اور چوتھی طرف حلب واقع ہے۔اس سرسبز زرعی اور میدانی علاقے کے لوگوں کی اکثریت زیور تعلیم سے آراستہ ہے۔یہ تمام شامی لوگوں سے زیادہ پڑھے لکھے ہیں۔یہاں زرعی یونیورسٹی ہے۔رقبہ کے لحاظ سے شام کا یہ سب سے بڑا صوبہ ہے۔جس کی آبادی 800,000 افراد پر مشتمل ہے۔

حمص کے خوبصورت شہر کو یہ شرف بھی حاصل ہے کہ یہاں دنیائے اسلام کے سب سے بڑے سپہ سالار خالد بن ولیدؓ ابدی آرام فرما رہے ہیں۔

خالد بن ولیدؓ کا مزار

حضرت خالد بن ولیدؓ کا مزار حمص شہر کے عین درمیان میں شہر کی بڑی شاہراہ کے کنارے ایک خوبصورت اور کشادہ جگہ پر واقع ہے۔ہماری کوچ روضے کے عین سامنے کھڑی ہوئی۔مزار کی حدود میں داخل ہوئے تو سامنے خوبصورت لان اور باغیچے تھے۔جن میں خوبصورت پھول ماحول کو معطر کر رہے تھے۔ہم اس وسیع اور چاروں طرف پھیلے باغیچے سے گزر کر مسجد میں داخل ہوئے۔

مسجد کے اندر دائیں طرف اسلام کے اُس عظیم ترین سپہ سالار کا مزار ہے جسے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے سیف اللہ کا خطاب عطا کیا تھا۔

مزار پر نگاہ ڈالی تو اپنے آپ کو دنیا کا خوش قسمت ترین آدمی پایا۔اللہ کا شکر ادا کیا کہ جس نے اس سفر کی توفیق دی۔

خالد بن ولید کون تھے؟

اس کا جواب ایک مؤرخ نے بڑا مختصر اور جامع دیا کہ:

☆ ”سیف اللہ دنیا کے پہلے اور آخری فاتح اعظم ہیں جنہوں نے ختم المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم کے عساکر مقدسہ میں اپنی تلوار سے تہلکہ ڈال دیا۔

☆ تمام جھوٹے نبیوں اور ان کے اماموں کے سر کاٹ کر دربار خلافت کی سیڑھیوں پر پھینک دیے۔

☆ اپنے زمانے کے سب سے عظیم الشان اور جلیل المرتبہ شہنشاہوں کی بے نظیر فوجوں اور بے مثال سپہ سالاروں کے پرزے اڑا دیئے۔

☆ خالد بن ولیدؓ اگر فرانس میں پیدا ہوئے ہوتے تو شکست نصیب نپولین کی بجائے خالد بن ولیدؓ پر سینکڑوں کتابیں لکھی جا چکی ہوتیں لیکن ہم مسلمان بے چارے!!"

خالد بن ولیدؓ کی پوری زندگی جہاد میں گزری۔ جسم کے ہر حصہ پر تلوار کے زخم کھائے لیکن شہادت نصیب نہ ہو سکی۔ ان کے نام سے دشمن کانپتے تھے۔ سنا ہے رومی فوج کے گھوڑے سیف اللہ کا نام سن کر چشموں سے پیاسے بھاگ جاتے تھے۔ سیف اللہ کی تلوار جب بھی اٹھی اسلام کے دشمن کے خلاف اٹھی اور جب بھی چلی مظلوموں اور بے کسوں کی حفاظت کے لئے۔

خالد بن ولیدؓ نے حمص کے مقام پر آخری بار تلوار کھول کر اعلان کیا کہ:

"خدا اس دن سے عالم اسلام کو محفوظ رکھے جب یہ دوبارہ میرے شانے پر آراستہ ہو۔"

خالد بن ولیدؓ کو عمر خطابؓ نے حالت جنگ میں سپہ سالاری سے معزول کر کے آپ کی جگہ ابو عبیدہؓ کو سپہ سالار تعینات کیا تو آپ بغیر چوں وچراں حضرت ابو عبیدہؓ کے ہاں حاضر ہوئے اور اپنے آپ کو بحیثیت سپاہی پیش کیا۔ یہی کچھ سوچتے ہوئے میں مزار کے ایک کونے سے سر لگا کر بیٹھ گیا۔ میں نے کسی سے کوئی بات نہیں کی میری حالت اس وقت علامہ اقبال کے اس شعر کی مظہر تھی کہ:

گفتار کے اسلوب پہ قابو نہیں رہتا
جب روح کے اندر متلاطم ہوں خیالات

روح کے اندر جب خیالات متلاطم ہوئے تو آنکھوں نے دل کی غمازی کی اور دلی کیفیت کو آنسوؤں کی صورت میں آشکارا کر دیا۔ مجھے محسوس ہوا جیسے کسی نے مجھے بازو سے پکڑ کر اٹھایا اور ساتھ لیکر روضے کے سرہانے لا کھڑا کیا۔ پھر میرے ساتھ کھڑے ہو کر دعا مانگی:

"اے باری تعالیٰ آج مسلمان بڑی تنگ دستی کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ فلسطین، عراق، افغانستان، کشمیر، بوسنیا اور چیچنیا کے مسلمانوں پر کفار ظلم کے پہاڑ ڈھا رہے ہیں۔ ان مظلوم مسلمانوں کی پکار کسی کے

کانوں میں نہیں پڑتی۔ ظالموں نے ظلم کی انتہا کر دی ہے۔ ہماری آن شان اور وقار ختم ہو گیا ہے۔ اے باری تعالیٰ آج ہمیں دوبارہ خالد بن ولیدؓ کی ضرورت ہے۔ مسلمانوں پر رحم فرما اور انہیں کوئی ایسا جنرل عطا کر جو انہیں دشمنوں کے ظلم سے نجات دلائے۔"

یہ کہتے کہتے کسی کی سسکیاں نکلنے لگیں اور پھر زور زور سے رونے کی آواز آئی میں نے پلٹ کر دیکھا تو یہ حاجی کرامت حسین تھے۔

حاجی کرامت حسین کو زار و قطار روتے ہوئے دیکھا تو مجھے یوں محسوس ہوا کہ:

گئے دن کہ تنہا تھا میں انجمن میں
یہاں اب مرے رازداں اور بھی ہیں!

دعا مانگنے کے بعد میں نے دو رکعت نماز نفل ادا کی اور پھر روضے کا جائزہ لیا۔ روضہ مسجد کے اندر ہے لیکن قبر پر مقبرہ ہے۔ اردگرد جالیاں ہیں۔ جالیوں کے ساتھ یہاں بھی میں نے تالے اور کپڑے باندھے ہوئے دیکھے۔ اس سے پتہ چلتا تھا کہ ایسا کرنا یہاں کے عقیدت مندوں کا کام ہے۔ مقبرہ کے باہر ایک بورڈ پر لکھا ہوا ہے:

ھذا مقام الصحابی الجلیل سیدنا خالد بن ولید رضی اللہ عنہ
عاشق نبی علیہ السلام

اس کے علاوہ مقبرے پر یہ شعر بھی لکھے ہوئے ہیں:

خالد بن ولید سیف من
خالد سیف من سیوف اللہ
سیوف اللہ سلہ اللہ علی المشرکین
و نمر فتی العشیرۃ

قبر پر سبز چادریں بچھی ہوئی تھیں سر پر عرب کی روایات کے مطابق ایک سبز پگڑی رکھی ہوئی ہے۔ باہر کا گنبد سبز ہے جس پر جھنڈا لہرا رہا ہے اس پر کلمہ شریف لکھا ہوا ہے۔ گنبد پر خوبصورت نقش و نگار ہیں۔

مزار کے ساتھ مسجد ہے۔ جو بڑے بڑے چار خوبصورت ستونوں پر کھڑی ہے۔ پوری

مسجد کا چھت ایک گنبد کی طرح ہے۔ مسجد کی لمبائی چالیس گز اور چوڑائی بھی چالیس گز ہوگی۔ اسی مسجد کے ایک کونے میں عبداللہ بن عمر خطاب ؓ کی قبر ہے۔ ہم نے وہاں بھی فاتحہ پڑھی۔

میں مسجد سے باہر نکلا تو مزار سے ملحق مدرسہ کے بچوں نے مجھے گھیر لیا۔ بچوں نے فوٹو بنوانے کی فرمائش کی۔ میں نے خالد بن ولید ؓ کے مجاہدوں کے ساتھ فخریہ فوٹو بنوایا۔ فوٹو بنوا کر بچے خوشی خوشی دوڑتے ہوئے اپنی کلاسوں میں چلے گئے۔ جب میں بچوں کے ساتھ فوٹو بنوا رہا تھا اس وقت چند ساتھی حلب کی زیارتوں پر جلدی پہنچنے کے لئے بیتاب تھے جبکہ ''فرقہ تصویریہ'' ویڈیو بنانے میں مصروف تھا اسی ہنگامے میں حاجی کرامت حسین کے جوتے گم ہو گئے۔ تلاش کے بعد جب نہ ملے تو انتظامیہ سے رابطہ قائم کیا۔ انہوں نے سٹور سے پرانے جوتوں کا ایک جوڑا حاجی صاحب کو دیا۔ ان پرانے جوتوں کو حاجی کرامت صاحب نے خالد بن ولید ؓ کے مزار کی سوغات سمجھ کر ایک قیمتی اثاثہ کے طور پر رکھ لیا اور پھر سارے سفر میں ہنس ہنس کر کہتے رہے؛

''مجھے خالد بن ولید ؓ کے دربار سے جوتے ملے''

مسجد اور مزار کے باہر باغیچے میں ایک بہت اونچا مینار ہے۔ جس پر خالد بن ولید ؓ کی وصیت تحریر ہے۔

''میں نے ایک سو سے زائد جنگیں لڑیں۔ میرے جسم پر کوئی ایسی جگہ نہیں جہاں تیروں کے نشان نہ ہوں۔ اس کے باوجود اپنے گھر چارپائی پر بزدلی کی موت مر رہا ہوں۔''

خالد بن ولید ؓ کے مزار پر ایک گھنٹہ رہنے کے بعد ساڑھے گیارہ بجے ہم حلب کی طرف چل پڑے۔ حمص سے حلب کوئی دو سو کلو میٹر ہوگا۔ یہ تمام علاقہ سرسبز تھا۔ لوگوں کو کھیتی باڑی میں مصروف دیکھا جو جدید طریقوں سے کھیتی باڑی کر رہے تھے۔ جگہ جگہ ٹیوب ویل اور زمینوں کو سیراب کرنے کے لئے پانی کے فوارے تھے جو چاروں طرف حرکت کر رہے تھے۔ لوگوں کو ہل چلاتے دیکھا تو اپنا پنجاب یاد آیا۔

یہ علاقہ بالکل پنجاب کی طرح تھا، ٹیوب ویلوں کے ساتھ زمینداروں کے ڈیرے بھی دیکھے۔ بعض جگہ گائیں اور دوسرے مال مویشی بھی چرتے نظر آئے۔ کھیت کھلیانوں کے ساتھ

ساتھ سڑک کے کنارے جگہ جگہ سنگ مرمر کو تراشنے اور تعمیراتی لکڑی کے کارخانے بھی دیکھے۔ لوگ خوشحال اور صحت مند ہیں۔ان سبزہ زاروں میں سفر کرتے ہوئے ہم ڈھائی بجے حلب پہنچے۔

حلب

حلب شہر ترکی سے 35 کلومیٹر دور ہے۔شہر میں داخل ہوئے تو دور سے شہر کے عین وسط میں اونچی جگہ حلب کا قلعہ نظر آیا۔ یہ قلعہ صلاح الدین ایوبی کے بیٹے ظاہر غازی نے بارہویں صدی میں تعمیر کروایا تھا۔حلب کی بڑی تاریخی حیثیت رہی ہے۔مشرق وسط کے ساتھ ترکی اور روس کے زیر تسلط نئی آزاد ہونے والی ریاستوں کا واحد رابطہ حلب ہے۔یہ ایک صنعتی شہر ہے جہاں جوتے سازی اور کاٹن کی فیکٹریاں ہیں۔ حلب میں زیادہ تر آرمینیا کے لوگ آباد ہیں۔ترکوں نے جب آرمینیا کے لوگوں کا قتل عام کیا تو بہت سے لوگ ملک چھوڑ کر حلب میں پناہ گزیں ہوئے۔ یہاں کرد اور دوسرے علاقوں کے لوگ بھی آباد ہیں کچھ ترک بھی ہیں۔تاریخ بتاتی ہے کہ حلب کا شہر تین ہزار سال پرانا ہے۔شہر ملٹی کلچرل ہے۔

میں نے یہاں ہندوستان کی فلم ''قسمت'' کے پوسٹر اسی انداز میں دیکھے جس طرح وطن عزیز میں چوکوں اور درختوں سے لٹکے ہوتے ہیں۔

حلب پہنچتے ہی بزرگوں کے قول'' پہلے طعام پھر کلام'' کی پیروی کی اور العزیزیہ کے علاقہ میں''الکرم'' نامی ریستوران میں کھانا کھایا۔حلب کے کھانے پوری عرب دنیا میں مشہور ہیں لیکن ہم غالباً غلط جگہ آ گئے تھے۔کھانا انتہائی بدذائقہ تھا۔ریستوران کے سامنے ایک پارک تھا میں کھانا کھا کر پارک کے کنارے جا بیٹھا۔میرے بیٹھتے ہی آٹھ آٹھ دس دس سال کے لڑکے صندوقچیاں اٹھائے !''المع حذاء...... المع حذاء''یعنی''بوٹ پالش...... بوٹ پالش''پکارتے میرے اردگرد چکر لگانے لگے۔بالکل اسی طرح جس طرح وطن عزیز میں پٹھان بچے'' پالش پالش'' کرتے پھرتے ہیں۔ میرے مسلسل انکار پر وہ مایوس ہوکر بخشیش بخشیش کرنے لگے یعنی اب انہوں نے بھیک مانگنی شروع کر دی تھی۔اتنے میں ایک عرب راہگیر اُدھر سے گزرا اور اس نے ان بچوں کو وہاں سے بھگایا۔

کھانے سے فارغ ہوکر ہم مسجد امیہ گئے۔ یہ مسجد سلیمان بن عبدالملک نے

715ء میں تعمیر کروائی تھی۔ پھر 1159ء میں نورالدین زنگی نے اس کی تعمیر نو کی۔ 1260ء میں منگولوں نے مسجد کو تباہ کر دیا اور بعد میں ترک حکمرانوں نے اس کی پھر تعمیر نو کی۔

جب ہم مسجد میں پہنچے تو عصر کا وقت ہو چکا تھا۔ ہم نے وضو خانہ تلاش کیا جو مسجد کے باہر نہایت خستہ حالت میں تھا۔ مسجد کے سامنے بہت بڑا کورٹ یارڈ یعنی احاطہ ہے۔ اس کے عین وسط میں بھلے وقتوں میں غالباً فوارہ ہوگا۔ جہاں لوگ وضو کرتے ہونگے۔ مسجد کی حالت خستہ تھی۔ اور اب اس کی مرمت کا کام جاری تھا۔ کورٹ یارڈ کے سامنے مسجد اور اس کے دائیں جانب حضرت زکریا علیہ السلام نبی اللہ کا مزار ہے۔ نماز پڑھنے کے بعد ہم حضرت زکریا علیہ السلام نبی اللہ کے مزار پر حاضر ہوئے۔

نبی اللہ زکریا علیہ السلام

حضرت زکریا علیہ السلام کا روضہ مسجد کے کورٹ یارڈ کے دائیں جانب ہے۔ قبر پانچ فٹ اونچی ہے جس پر سبز رنگ کی چادریں تھیں اور سر کے اوپر سبز عمامہ تھا۔ مقبرے کے تین طرف دیوار اور ایک طرف جالی تھی۔ جہاں سے زائرین اندر دیکھ سکتے تھے۔ مقبرہ بارہ فٹ چوڑا اور دس فٹ لمبا ہوگا۔ مکانیت اتنی تنگ تھی کہ بمشکل ہی کوئی آدمی اندر گھوم پھر سکتا تھا۔

دیواروں پر منقش ٹائلیں لگیں تھیں۔ سامنے کی دیوار پر تین فریم لٹکے ہوئے تھے۔ دائیں طرف کے فریم میں ''اللہ تعالیٰ'' درمیان والے میں ''آیات الکرسی'' اور بائیں جانب ''محمد ﷺ'' لکھا ہوا تھا۔ ایک کونے میں پرانا چھوٹا تپائی نما ٹیبل تھا۔ اس کے قریب جھاڑو اور ایک لوٹا نما برتن رکھا تھا۔ فرش پر سرخ رنگ کا بوسیدہ کارپٹ تھا جو آدھے فرش پر تھا۔ قبر پر بچھی سبز چادر پر قرآنی آیات لکھی ہوئی تھیں۔ چھت سے روشنی کی قندیل لٹک رہی تھی مقبرے کے اوپر گنبد تھا۔ مقبرے کی حالت اچھی نہیں تھی۔ معلوم ہوتا تھا کہ صفائی کا بھی کوئی خاص انتظام نہیں۔ حضرت زکریا علیہ السلام کے مقبرہ کی نسبت دمشق میں ان کے بیٹے حضرت یحیٰی علیہ السلام کا مقبرہ زیادہ بہتر حالت میں نظر آیا۔ مقبرے میں ہمارے سوا اور کوئی زائر دکھائی نہ دیا۔ میں نے جتنے مقبرے دیکھے وہاں ایران اور پاکستان کے لوگوں کے علاوہ کسی اور کو نہیں دیکھا۔

مسجد کے باہر بازار تھا جو پرانے بازاروں کی طرح تنگ تھا اور یہاں خاصی بھیڑ تھی۔ دکانوں میں چیزیں بے ترتیبی سے لگی ہوئی تھیں۔ ہم حضرت زکریا علیہ السلام کے مقبرے سے باہر نکلے تو مسجد کے احاطے میں عمر رسیدہ لوگ لکڑی کے سٹولوں پر بیٹھے مانگ رہے تھے۔ میں ان مانگنے والوں سے جان چھڑا کر باہر آ گیا۔ مسجد کے قریب ہی مدرسہ حلوایہ یعنی مدرسہ شیریں دیکھا۔ (میں نے زندگی میں پہلی بار شیریں مدرسہ دیکھا ورنہ اس سے قبل تو ہمیشہ اس کے الٹا ہی سنتا اور دیکھتا رہا تھا۔ مجھے افسوس ہے کہ میں اندر جا کر مدرسے کی شیرینی کا پتہ نہ کر سکا)۔ یہ مدرسہ سلطان صلاح الدین ایوبی کی بہو حلینا نے قائم کیا تھا۔ مدرسہ میں دور دور سے طالب علم آ کر تعلیم حاصل کرتے تھے۔ یہاں مجھے ایک عرب لڑکا ملا جو کافی دیر مجھ سے انگریزی میں باتیں کرتا رہا۔ بعد میں جب ہم قلعے کے سامنے کیفے ٹیریا میں تھے تو وہ لڑکا وہاں بھی آ پہنچا۔ اس دوران اس نے رازدارانہ لہجے میں بتایا کہ وہ یورپی سیاحوں سے مل کر اپنی انگریزی بہتر کر رہا ہے۔

امام نقشبندی اور امام بخاری کے مقبرے

مسجد امیہ سے نکلے تو پرانے شہر کے آخر پر ماقم گیٹ کے قریب مسجد فردوس میں جا پہنچے۔ یہ مسجد سلطان صلاح الدین ایوبی کی بہو دافعیہ خاتون نے 1234ء میں بنوائی تھی۔ مسجد بہت عالی شان ہے۔ اس کے ساتھ مزار بھی ہیں۔ ایک مدرسہ بھی ہے۔ یہاں ہم نے مغرب کی نماز ادا کی۔ نماز کے بعد امام صاحب ہمیں مسجد کے بائیں طرف کے ایک کمرے میں لے گئے جس میں تین قبریں تھیں۔ ان کے بارے میں بتایا گیا کہ ایک قبر حضرت امام نقشبندی کی ہے جبکہ دوسری قبر والی جگہ امام صاحب کی بیٹھک تھی اور تیسری قبر کے بارے میں کوئی علم نہیں۔

امام صاحب ہمیں مسجد کے دائیں طرف والے حصہ میں بھی لے گئے جہاں تین قبریں تھیں انہوں نے بتایا کہ ایک قبر امام بخاری کی دوسری ان کی بیگم کی اور تیسری ان کے خادم کی ہے۔ یہ سن کر مجھے کچھ شک ہوا کہ یہ بات صحیح نہیں۔ میرے علم کے مطابق امام بخاری کی قبر سمرقند کے قریب ایک گاؤں ''خرتنگ'' میں ہے۔ جہاں یکم شوال ۲۵۶ ہجری بعد نماز عشاء آپ نے داعی اجل کو لبیک کہا۔

ممکن ہے یہ کوئی اور امام بخاری ہوں۔

مسجد سے نکلتے وقت ہمارے قافلے میں شامل خواتین نے مسجد سے مصلے خریدنے شروع کر دیئے۔ یہ دیکھا تو حاجی رشید صاحب بولے: ''لوگ تو مسجدوں میں مصلے لا کر رکھتے ہیں اور آپ یہاں سے انہیں باہر لے جا رہے ہیں۔'' امام مسجد چوبیس پچیس سال کا ایک نوجوان تھا ہمارے ساتھیوں نے یہاں بھی حسب معمول اپنی فیاضی دکھائی تو نوجوان امام نے ایک آدمی کو حکم دیا کہ سبز کپڑا اپھاڑ کر ہم سب میں بطور تبرک تقسیم کرے۔

میں اس تبرک سے محروم رہا۔ مجھے یہ سوچ ستا رہی تھی کہ امام بخاری کی دو قبریں کیسے ہو گئیں؟

حلب کا قلعہ اور بازار کی سیر

شام پانچ بجے ہم واپس حلب کے قلعہ میں پہنچے۔ سب سے پہلے۔ ہم قلعہ کے بالکل سامنے خان الشونی مارکیٹ میں گئے۔ خان مارکیٹ حلب کی مشہور ترین مارکیٹ ہے جہاں ہینڈی کرافٹ یعنی دستکاری اور گفٹ شاپس کی کثرت ہے۔ ہم کافی عرصہ مارکیٹ میں گھومتے اور تحفے تحائف خریدتے رہے۔ حاجی رحمان صاحب اپنی بیٹی کے لئے کوئی تحفہ خریدنا چاہتے تھے اس لئے وہ بار بار مجھ سے مشورہ لیتے رہے کہ کیا خریدا جائے!

مجھے بھی اپنی بیٹیوں کے لئے تحفے خریدنے تھے۔

ظہور نے جو خود بھی باکمال خطاط ہیں۔ اس مارکیٹ سے ایک کاتب سے تبرکاً اپنا نام لکھوایا۔ حاجی رشید صاحب، حاجی کرامت صاحب اور حاجی شاہ پال صاحب نے بھی بچوں کے لئے تحفے خریدے۔ خالد صاحب اپنے بیٹے نصرت کا ہاتھ پکڑے اسے کبھی ایک چیز اور کبھی دوسری چیز دکھاتے اور خرید کر دیتے رہے۔

یہاں سے نکلے تو قلعے کے سامنے کے ایک کیفے ٹیریا میں جا بیٹھے۔ یہ چائے خانہ سیاحوں کا مرکز تھا۔ ہم وہاں کافی دیر چائے کی چسکیاں لے لے کر گپ شپ کرتے رہے۔

کیفے ٹیریا سے اٹھے تو میں قلعہ دیکھنے نکل گیا۔ قلعہ زمین سے پانچ سو گز اونچا ہے اور تنور کی مانند گولائی میں ہے۔ اردگرد ایک گہری خندق ہے جس میں زمانہ قدیم میں پانی بھر دیا جاتا تھا تاکہ دشمن قلعہ میں داخل نہ ہو سکے۔ قلعہ کے اندر دو مسجدیں ہیں۔

مجھے کچھ کتابوں کی ضرورت تھی۔ چنانچہ میں حلب کے ساحۃ رائس شاپنگ سینٹر گیا۔ اس ماڈرن شاپنگ سینٹر سے کتابیں خریدیں اور نوجوان عرب نسل پر مغرب کا غلبہ بھی دیکھا۔ یہ رنگ میں دمشق میں بھی دیکھ چکا تھا عرب کی نوجوان نسل اور مغربی نوجوانوں میں صرف زبان کا فرق ہے ورنہ ان کے رنگ ڈھنگ سب ایک جیسے ہیں۔ عرب نوجوانوں کو مغربی رنگ ڈھنگ میں دیکھ کر علامہ اقبال بڑی شدت سے یاد آتے رہے:

وضع میں تم ہو نصاریٰ تو تمدن میں ہنود
یہ وہ مسلماں ہیں! جنہیں دیکھ کے شرمائے یہود!

جب میں قلعہ کو گھوم پھر کر دیکھ رہا تھا اس وقت ہمارا گائیڈ اور الحاج یونس اویسی حلب کے ایک بزرگ سید مسعود حلبی اور سید ابو عباس کے مزار کی تلاش کرتے رہے۔ لیکن تلاش کے باوجود ناکامی ہوئی۔

الحاج یونس اویسی ملنسار، غصہ پر قابو پانے والے اور ڈپلومیٹ طبیعت کے مالک ہیں۔ میں نے انہیں اس سفر میں کبھی غصہ میں نہیں دیکھا لیکن اُس شام ان کا مزاج کافی گرم تھا۔ شام ساڑھے سات بجے کے قریب ہم حلب سے روانہ ہوئے تو الحاج یونس اویسی نے اپنے غصہ کا اظہار کر ہی دیا اور گائیڈ نادر پر برس پڑے اسے سست اور ناکام گائیڈ قرار دیا چونکہ وہ حلب کے دو مشہور بزرگوں سید مسعود حلبی اور سید ابو عباس کے مزار تلاش کرنے میں ناکام رہا تھا۔ بے چارے نادر نے اپنے دفاع میں دلائل دیئے ٹورسٹ گائیڈ دکھائی مختلف لوگوں اور مساجد میں جا جا کر پوچھا۔ لیکن ہر ایک نے لاعلمی کا اظہار کیا۔ حلب سے روانگی کچھ پھیکی پھیکی سی رہی۔

دمشق واپسی کا سفر کرتے ہوئے رات گیارہ بجے موٹر وے کے ایک موٹل میں اترے۔ ہم نے رات کا کھانا یہیں کھایا۔ کھانا ہمارے سامنے تازہ تیار ہوا۔ باورچی نے پہلے قیمہ لیا۔ پھر اس میں مرچ مصالے لگا کر اس کو خوب گوندھا اور جب سب چیزیں یکجان ہو گئیں تو پھر قیمہ کو پیزے (PIZZA) کی طرح روٹی پر رکھ کر ایک تنور میں رکھا جب روٹی اور قیمہ دونوں پک گئے تو گرم گرم ہمیں پیش کیا۔ کھانا انتہائی لذیذ تھا۔

یوں گھومتے گھامتے کھاتے پیتے تقریباً سات سو کلومیٹر کا سفر کرنے کے بعد ہم

رات ایک بجے دمشق پہنچے۔

دمشق میں آخری دن

دمشق میں آخری دن کافی مصروف رہا۔قائد قافلہ نے رات کو ہی حکم دے دیا تھا کہ علی الصبح اپنا سامان باندھ لیا جائے تاکہ روانگی میں تاخیر نہ ہو۔ہم نے صبح اٹھ کر سامان باندھا اور کمرے میں رکھ کر ڈائننگ ہال میں ناشتہ کرنے چلے گئے جہاں قافلے کے سب آدمی ناشتہ میں مصروف تھے۔ظہور آرٹسٹ اپنے کمرہ میں کچھ ضروری سامان لینے کی خاطر گئے لیکن الٹے پاؤں پریشانی کے عالم میں لوٹے اور مخاطب ہوئے:

"نظامی صاحب! ہمارا تو سامان چوری ہو گیا۔اب میں پہنوں گا کیا؟"

سب پریشان ہو گئے اور ناشتہ کرنا چھوڑ دیا۔حاجی یونس اویسی شکایت کرنے کاؤنٹر کی طرف بڑھے لیکن میں نے انہیں روک دیا۔ظہور صاحب کو ساتھ لیا اور اُن کے کمرہ میں جا پہنچا۔کمرہ کھولا تو سامان جیسے ہمارا منہ چڑا رہا تھا۔

ظہور صاحب سامان کو دیکھ کر اور پریشان ہوئے۔کہنے لگے"یہ کوئی جادو کا کھیل ہے یا پھر جناتی کام۔"

میں نے کہا:"ظہور صاحب سامان تو یہاں ہی ہے آپ کو یقیناً کوئی غلط فہمی ہوئی ہے۔"

اصل میں ہوا یہ تھا کہ ظہور صاحب چوتھی منزل کی بجائے تیسری منزل پر اپنا سامان تلاش کرتے رہے۔ہم واپس ڈائننگ ہال میں آئے تو سب ساتھی پریشان تھے۔انہیں اصل حقیقت بتائی تو سب نے زوردار قہقہہ لگایا۔ہنستے ہنستے لوٹ پوٹ ہو گئے۔قہقہہ کی گونج میں اٹھے اور دمشق کی زیارتوں کے لئے روانہ ہو گئے۔

حجر بن عدیؓ کا مزار

صبح گیارہ بجے ہم دمشق کے شمال مغرب کی طرف سفر کرتے ہوئے شہر سے کوئی تیس کلومیٹر دور حجر بن عدیؓ کے مزار پر حاضر ہوئے۔یہ مزار ایک گاؤں میں واقع ہے۔ساتھ میں مسجد ہے۔ہم اندر گئے دعا مانگی اور اردگرد گھوم کر جائزہ لیا۔یہاں اہل تشیع حضرات کی کثرت دیکھی۔پانچ فٹ اونچی قبر نوٹوں سے بھری ہوئی تھی۔نوٹوں پر امام خمینی

کی تصویریں تھی جس سے پتہ چلتا تھا کہ یہ حکومت ایران کے جاری کردہ ہیں۔

مزار کے باہر کپڑوں کے سٹال تھے۔ موسم خوشگوار تھا۔ سٹالوں پر چہل پہل تھی۔ مزار کے باہر میٹھی میٹھی دھوپ میں کھڑے ہو کر میں نے گائیڈ سے حجر بن عدیؓ کے بارے میں مزید معلومات حاصل کیں:

حجر بن عدی صحابی رسول صلی اللہ علیہ وسلم تھے۔ ان کا تعلق کوفہ سے تھا۔ حضرت علیؓ کے فدائیوں میں شمار ہوتے تھے۔ جب حضرت معاویہؓ برسر اقتدار آئے تو انہوں نے حضرت علیؓ پر سب وشتم کا سلسلہ جاری کیا۔ حضرت حجر بن عدیؓ کو یہ پسند نہیں تھا۔ چنانچہ زیاد گورنر کوفہ جب ممبر رسول پر کھڑے ہو کر حضرت علیؓ پر سب وشتم جاری کرتے تو حجر بن عدیؓ ان پر کنکر پھینکتے تھے۔ ایک بار کوفہ میں عمرو بن الحریث نے، جو زیاد کی جگہ قائم مقام گورنر تھے۔ حسب معمول حضرت علیؓ پر سب وشتم جاری کیا تو حجر بن عدیؓ نے ان پر بھی کنکریاں پھنکیں۔ عمرو نے انہیں گرفتار کر کے دمشق میں امیر معاویہؓ کے پاس بھیجا اور انہیں لکھا کہ یہ شخص فتنہ کی بنیاد ہے۔ حضرت امیر معاویہؓ نے چند شہادتیں لیں اور حجر بن عدیؓ کو قتل کر دیا۔

حضرت حجر بن عدیؓ بڑے رتبہ کے صحابی تھے ان کے قتل کا بہت برا اثر ہو۔ حضرت عائشہؓ نے ان کی گرفتاری سے قبل ہی امیر معاویہؓ کے پاس آدمی دوڑائے۔ لیکن انکے پہنچنے سے پہلے ہی انہیں قتل کر دیا گیا۔

آئندہ سال جب حضرت امیر معاویہؓ حج کے لئے گئے تو حضرت عائشہؓ کے ہاں حاضر ہوئے حضرت عائشہؓ نے پوچھا:

"معاویہ! تم کو حجر بن عدیؓ اور ان کے ساتھیوں کے قتل پر خدا کا خوف نہیں آیا۔"

معاویہؓ نے عرض کیا:

"انہیں ان لوگوں نے قتل کیا جنہوں نے ان کے خلاف شہادتیں دی تھیں۔"

اصحاب کہف

حجر بن عدیؓ کے مزار پر حاضری کے بعد واپس دمشق شہر آتے ہوئے ہمارے دائیں ہاتھ شہر کا دامن کوہ یعنی قاسیون کی پہاڑیاں اور بائیں ہاتھ شہر کا میدانی حصہ تھا۔

گائیڈ نے اشارہ کر کے پہاڑیوں کے درمیان ایک غار کی نشاندہی کی کہ اگر ہم چاہیں تو وہاں جاسکتے ہیں لیکن وہاں گاڑی نہیں جاتی اور ایک گھنٹہ کا پیدل سفر ہے۔

جب ہم نے پوچھا کہ اس غار میں کیا ہے تو بتایا گیا کہ یہ اصحاب کہف کی غار ہے۔

جہاں حضرت جبریل امین کے پروں کے نشان چھت پر لگے ہوئے ہیں۔

میں نے پوچھا: ''وہ کیسے''

گائیڈ نے بتایا: '' قابیل نے اپنے بھائی ہابیل کو اسی غار میں قتل کیا تھا۔ لیکن جب قتل کرنے لگا تو اللہ تعالیٰ نے حضرت جبریل کو بھیجا کہ وہ اُسے قتل کرنے سے روکے۔ حضرت جبریل نے قابیل کو روکنے کے لئے ہاتھ اوپر اٹھائے تو ان کے پر غار سے لگے جس کے نشان ابھی تک وہاں موجود ہیں۔''

میں نے پوچھا: ''اگر جبریل امین حضرت اسماعیل علیہ السلام کو چھری کے نیچے سے بچا سکتے تھے تو یہاں کیا بات ہوئی اور پھر ملک الموت بھی تو فرشتہ تھا اللہ تعالیٰ نے اسے براہ راست حکم کیوں نہیں دیا۔''

اس پر گائیڈ خاموش ہو گیا۔

اصحاب کہف کی غار کے بارے میں یہ دعویٰ بھی ہے کہ وہ اردن میں ہے۔

جب کہ کچھ محققین کہتے ہیں کہ وہ ترکی میں ہے۔

حضرت اویسؓ قرنی کا مزار

غار میں جانے کی بجائے سب نے حضرت اویس قرنیؓ کے مزار پر حاضری دینے کو ترجیح دی چنانچہ ہم دوبارہ قبرستان اہل بیت گئے۔ جہاں سڑک کے کنارے ہی حضرت اویس قرنیؓ کا مزار ہے۔ ہم نے جالیوں سے جھانک کر دیکھا تو ظاہر ہوتا تھا جیسے مزار پر عرصہ سے کسی نے جھاڑو نہیں دیا۔ ہم نے دعا مانگی اور قبرستان کا دوبارہ دیدار کرتے ہوئے واپس آ گئے۔

قصہ ''سیف الملوک'' کا

حضرت اویس قرنیؓ کے مزار سے واپسی پر حاجی غنی نے گائیڈ سے کہا کہ ہمیں ''سیف الملوک'' کی قبر پر لے چلو۔ گائیڈ نے غالباً یہ بات زندگی میں پہلی بار سنی تھی اس

لئے بوکھلا کر مجھے دیکھنے لگا۔ میں نے اسے بتایا کہ ہمارے علاقہ میرپور آزاد کشمیر میں میاں محمد بخش صاحب پنجابی کے بہت بڑے شاعر ہوئے ہیں جنھوں نے ''سیف الملوک...... سفر العشق'' نامی ایک خوبصورت کتاب تخلیق کی تھی۔ کتاب میں دو فرضی کرداروں ''سیف الملوک'' اور ''بدیع الجمال'' کے عشق کی داستان بیان کی گئی ہے۔ یہ سن کر حاجی غنی غصہ میں لال پیلا ہو کر مجھے کہنے لگا:

''تم ''سیف الملوک'' کے قصے کو سفر العشق، عشقیہ اور رومانی کہہ رہے ہو حالانکہ میاں صاحب نے اس کتاب میں پندرہ سپارے قرآن پاک کے شامل کیے ہیں۔''

میں نے سیف الملوک پڑھا ہوا ہے اور اس کتاب کو اس وقت سے سن رہا ہوں جب سے ہوش سنبھالا۔ میرے تایا زاد بھائی عبدالمجید شاکر مرحوم اردو پنجابی، پہاڑی اور گوجری کے خوبصورت شاعر تھے۔ شاعری کے علاوہ اللہ تعالیٰ نے انہیں خوش الحانی سے نوازا تھا۔ چنانچہ خوشی کے موقع پر جب وہ گھریلو محفلوں میں سیف الملوک خوش الحانی سے پڑھتے تو ہم سب انہیں خاموشی سے سنتے۔ کبھی کبھی شاکر صاحب سیف الملوک کی تشریح بھی کر کے ہمیں سمجھاتے یوں سیف الملوک کی یہ محفلیں رات گئے تک جاری رہتیں۔ اس طرح سیف الملوک سے میرے آشنائی بچپن سے تھی۔

چنانچہ جب میں نے پندرہ سپارے قرآن کا، سیف الملوک میں شامل ہونے والی بات سنی تو سوچا ان حاجی صاحب سے ٹکر لینا دیوار کے ساتھ سر پھوڑنے والی بات ہے۔ چنانچہ میں نے مسکرا کر بات ٹال دی۔

الحمدیہ مارکیٹ

سیف الملوک کی قبر کی بجائے ہم الحمدیہ مارکیٹ رکے۔ یہ ایک پرانے طرز کی بند مارکیٹ ہے۔ جس میں دکانداروں نے اپنے اپنے ایجنٹ چھوڑے ہوئے ہیں جو گاہکوں کو گھیر کر دکان پر لے جا کر اپنا کمیشن وصول کرتے ہیں۔ گائیڈ نے ہمیں بتایا کہ یہاں کے بازار کو صرف دیکھیں اور خریداری نہ کریں۔ اگر آپ نے کسی چیز میں دلچسپی لی۔ لیکن اُسے نہ خریدا تو دکاندار آپ کو گالیاں دے گا۔

جب میں دمشق جانے والا تھا تو محترم محمود ہاشمی صاحب نے بھی ہدایت کی تھی کہ

اگر الحمدیہ مارکیٹ گئے تو جیب کا خاص خیال رکھنا۔ ہاشمی صاحب کسی زمانے میں دمشق کی سیاحت کر چکے ہیں۔ میں نے ہاشمی صاحب کے تجربے سے فائدہ اٹھایا۔ مارکیٹ کا چکر لگایا لیکن جیب پر ہاتھ رکھ کر!

دمشق میں آخری دو گھنٹے میں نے حاجی شاہ پال، حاجی رحمان، حاجی غنی اور گائیڈ کی رہنمائی میں دمشق کے فیشن ایبل ایریا میں گھوم کر گزارے۔ ہم مختلف دکانوں پر گئے، تحائف خریدے اور جب واپس ہوٹل آئے تو کوچ ہمیں عراق لے جانے کے لئے کھڑی تھی۔ ہم نے سامان گاڑی میں رکھا۔ ہوٹل والوں کو خدا حافظ کہا اور شام کے سات بجے عراق کی جانب روانہ ہوئے گئے۔

دمشق سے عراق تک

دمشق سے عراق کی سرحد کوئی تین سو کلو میٹر ہے۔ ہم یہ سفر ایک آرام دہ اور خوبصورت کوچ میں سوا تین گھنٹے میں طے کرتے ہوئے عراق کی سرحد پر پہنچے۔ دمشق سے عراق کی سرحد تک کا تمام علاقہ ہموار لیکن بے آب صحرا پر مشتمل ہے جس میں دور دور تک ہمیں آبادی کے آثار نظر نہ آئے۔ سرحد پر جانے والی سڑک سنگل لیکن پختہ تھی۔ اس سفر میں ہمارا گائیڈ عادل نام کا ایک بہت ہی تیز طرار قسم کا آدمی تھا جس نے چند لمحات میں ہی ہمیں شامی سرحد سے فارغ کروا کر عراق کی سرحد کو روانہ کیا۔ گائیڈ خود یہاں اتر گیا لیکن ڈرائیور کو ہدایت کر گیا کہ وہ ہمیں عراقی سرحد پر کھڑی بغداد لے جانے والی کوچ میں بٹھا دے۔ اس نے ہم سے کہا کہ ہم عراقی احکام کو بالکل رشوت نہ دیں۔ اگر وہ مانگیں تو انگریزی میں بات کریں۔

دو ملکوں کی سرحدوں کے درمیان کچھ علاقہ ایسا بھی ہوتا ہے جس پر کسی کی ملکیت نہیں ہوتی۔ ہم نے وہ چار پانچ میل کا سفر طے کیا تو سرحد کے قریب عراقی سیکورٹی فورس نے گاڑی کھڑی کی اور ایک فوجی اپنی بندوق سمیت گاڑی میں داخل ہوا۔ اس نے بڑی کھردری نگاہوں سے گاڑی کا جائزہ لیا۔ اتنے میں مزید تین آدمی جنہوں نے چادریں لپیٹی ہوئی تھیں گاڑی میں داخل ہوئے اور بخشیش بخشیش کرنے لگے۔ ہم سب

خاموش رہے۔اور کوئی توجہ نہ دی ۔ وہ پانچ دس منٹ تک بخشیش بخشیش کرتے رہے۔ کبھی وہ ''منی منی Money'' بھی کہتے اور ''پیسے پیسے'' کا الاپ بھی کرتے۔ آخر کار تنگ آ کر حاجی کرامت صاحب نے جیب سے سگریٹ کا پیکٹ نکالا اور ایک ایک سگریٹ انہیں پیش کیا جس پر وہ استغفراللہ کا ورد کرتے ہوئے گاڑی سے اتر گئے۔

گاڑی عراقی سرحد پر آ کر کھڑی ہوگئی ۔ یہاں وہ کوچ بھی کھڑی تھی جس نے ہمیں بغداد لے جانا تھا۔ عراقی گائیڈ جس کا نام ابو مریم تھا ہماری گاڑی میں آ کر ہمیں ملا۔ حاجی یونس اویسی صاحب پاسپورٹ لیکر کسٹم احکام کے پاس گئے لیکن عراقی افسر تھے کہ وہ اویسی صاحب کو گھاس ہی نہیں ڈالتے تھے۔

گاڑی میں بیٹھے بیٹھے تین گھنٹے ہوگئے پھر حکم ہوا کہ سامان اُتار کر کسٹم احکام سے چیک کروایا جائے ۔ ہم نے گاڑی سے اپنا اپنا سامان نکالا۔ اب ہمیں ایک ٹھنڈے اور گندے ہال میں لے جایا گیا ۔ جہاں ایک ایک چیز کو اس طرح چیک کیا گیا جیسے ہم کوئی سمگلر ہوں ۔ حاجی کرامت حسین کے صندوق میں اُن کی کچھ ادویات ڈسپرین اور اسپرین تھیں انہیں دیکھ کر چیک کرنے والے افسر کی باچھیں کھل گئیں ۔ اُس نے اُن میں سے کچھ اپنے پاس یہ کہہ کر رکھ لیں کہ ہمیں ان کی بہت ضرورت ہے ۔ کیونکہ بین الاقوامی پابندیوں کی وجہ سے عراق میں ادویات کی سخت قلت ہے۔

سامان چیک کروا کر ہم دوبارہ واپس گاڑی میں آئے لیکن ہمیں آگے جانے کی اجازت نہ ملی۔

کافی دیر بعد ہمیں بتایا گیا کہ اہل عراق کو تین جوانوں کے خون کی ضرورت ہے۔ یہ سن کر ہم سب سناٹے میں آگئے اور ایک دوسرے کے منہ کی طرف دیکھنے لگے۔ آخر کار قافلے کی خاطر حاجی شاہ پال، خالد اور میں نے خون دینے کی پیشکش کر دی ۔ ہمیں ایک فوجی بیرک طرز کی عمارت میں لے جایا گیا ۔ جہاں کے کمپونڈر قسم کی ایک مخلوق نے ہم سے پیسے مانگنے شروع کر دیئے ۔ ہماری خاموشی پر وہ بھی خاموش ہوگئے لیکن ان کی خاموشی

دمشق کے پرانے شہر کا ایک منظر، درمیان میں مسجد امیہ نظر آ رہی ہے۔

anjumhasnain2008@yahoo.com
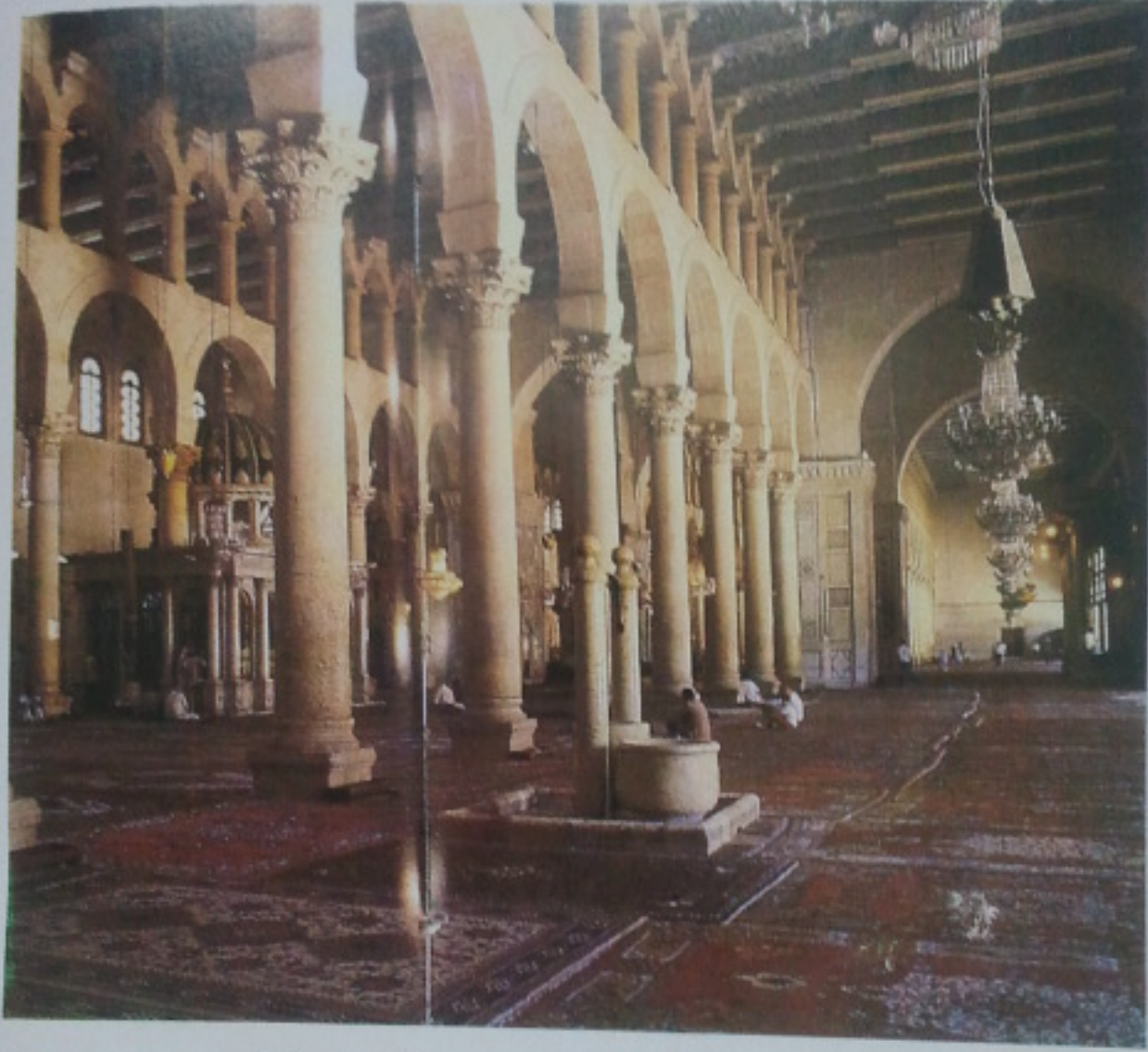
مسجد امیہ کا اندرونی منظر، دائیں طرف اندر نبی اللہ حضرت یحییٰؑ کا روضہ نظر آ رہا ہے۔

مسجد امیہ کا کورٹ یارڈ۔

مسجد امیہ کی سامنے والی دیوار کے اوپر ایگل گنبد پر درخت اور قدرتی مناظر کی عکاسی نظر آرہی ہے۔

حضرت یحییٰ نبی اللہ کا روضہ

قبرستان آلِ رسول کا ایک منظر، دور نیلے گنبد والا مقبرہ حضرت صفیہؓ زوجہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ہے۔

حلب میں مسجد امیہ کے احاطہ میں وقفہ وقفہ پر بیٹھے لوگ مانگ رہے ہیں۔

anjumhasnain2008@yahoo.com

حلب شہر کا ایک منظر، درمیان میں صلاح الدین ایوبی کے بیٹے کا تعمیر کردہ قلعہ نظر آ رہا ہے۔

حضرت زینبؑ کے روضہ کا اندرونی منظر۔

صلاح الدین ایوبی کی دو قبریں۔

حمص میں حضرت خالد بن ولیدؓ سیف اللہ کے مزار کا ایک خوبصورت منظر۔

anjumhasnain2008@yahoo.com

قبرستان اہل بیت رسول کا ایک اور منظر۔

حضرت بلال حبشیؓ کے مزار کا بیرونی دروازہ۔

حضرت بلال حبشیؓ کے مزار کا اندرونی منظر اور قبر۔

حضرت امیر معاویہؓ کی قبر کی کچی کوٹھی۔

حضرت امیر معاویہؓ کی قبر۔
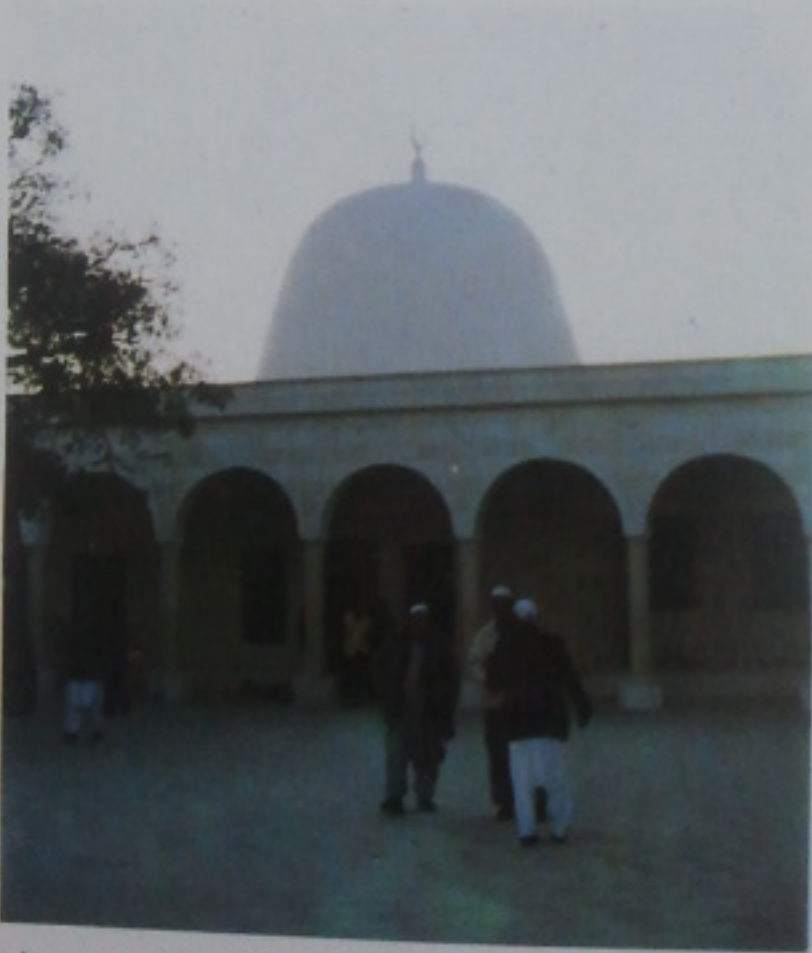
حضرت آدمؑ کے بیٹے حضرت ہابیل؛ جن کے بارے میں روایت ہے کہ وہ پہلے انسان ہیں جنہیں قتل کیا گیا

حضرت امیر معاویہ ؓ کی قبر کی نشاندہی کرنے والا مجاور یاسین مصنف کے ساتھ۔

anjumhasnain2008@yahoo.com

سفرِ عراق

- ☆ بغداد
- ☆ بابل
- ☆ کوفہ
- ☆ نجف
- ☆ کربلا

بغداد

منگل 23 نومبر 1999ء کی صبح کے آٹھ بجے ہیں۔ میں دریائے دجلہ کے کنارے المنصور ہوٹل کے کمرہ نمبر 108 کی بالکونی میں کھڑا ہوں۔ حد نظر تک بغداد شہر پھیلا ہوا ہے۔ ہر چیز دھوپ کی روشنی میں اُجلی اُجلی نظر آتی ہے۔ آسمان کی نیلی چھتری صبح کے وقت بہت بھلی لگ رہی ہے۔ شہر کے بیچوں بیچ دریائے دجلہ ہمیشہ کی طرح خراماں اپنی منزل کی طرف رواں ہے۔ آبی پرندے دریا کے اوپر اڑتے قلابازیاں لگا رہے ہیں۔ دریا کے اس کنارے ہوٹل کی طرف ایک پارک ہے جس میں خوبصورت پھول کھلے ہیں۔ تتلیاں اڑتی، پھولوں کا رس چوستی اور پھر اڑ جاتی ہیں۔ تتلیوں کے ساتھ ساتھ ہوٹل میں مقیم مسافر بھی صبح کی سیر کے لئے پارک میں جا بیٹھے ہیں جو مشرق کے رخ بیٹھ کر دھوپ تاپنے کے ساتھ ساتھ قدرت کے حسین مناظر سے لطف اندوز ہو رہے ہیں۔ ماحول پر سکون ہے۔

دریائے دجلہ ترکی کے پہاڑوں سے نکل کر ہزاروں میل کا سفر طے کرتا، صحرا کی پیاس بجھاتا دریائے فرات کے ساتھ مل کر شط العرب کی صورت میں خلیج فارس میں جا گرتا ہے۔

دریائے دجلہ ازل سے اسی روش، اسی چال اور رنگ میں اپنا سفر طے کرتا آیا ہے۔

زمانے نے کئی رنگ بدلے۔

لیکن

دریائے دجلہ کا ایک ہی رنگ رہا۔

دنیا کے کئی رنگوں میں سے ایک رنگ تو وہی ہے جب یہ سارا علاقہ ویران اور بنجر تھا۔ پھر 762ء میں عباسی خلیفہ ابو جعفر المنصور کی نظر اس خطہ پر پڑی تو اس نے جنگل کو منگل میں بدلنے کا فیصلہ کیا۔ مہندسین کو شہر کا نقشہ تیار کرنے کا شاہی حکم ملا اور دنیا کے مختلف حصوں سے معمار، سنگتراش، نجار اور نقاش جمع کیے گئے۔ جس ملک میں بھی اچھا تعمیراتی سامان ملتا اسے فوراً یہاں لانے کا حکم صادر کیا جاتا۔ حکم کی تعمیل ہوئی اور ایک ایسا شہر پناہ تعمیر ہوا جو اپنی مثل آپ ہے۔

بغداد شہر دریائے دجلہ کے مغربی کنارے پر ایک دائرے کی شکل میں آباد ہوا۔ شہر کے درمیان میں شاہی محل، پھر وزراء اور روساء کی کوٹھیاں، ان کے ساتھ مسجدیں، حمام اور عام لوگوں کی رہائش گاہیں تھیں۔ شہر کے گرد 35 گز بلند مضبوط دیوار بنائی گئی۔ پرانے شہر کے چار بڑے دروازوں کے نام باب الکوفہ، باب الشام، باب البصرہ اور باب الخراسان رکھے گئے۔ شہر کی سڑکیں چالیس چالیس گز کی کھلی بنائی گئیں۔

ایک کروڑ اسی لاکھ دینار کے خرچ کے بعد جب شہر تیار ہوا اور اسے دارالخلافہ کی حیثیت ملی تو دنیا کے کونے کونے سے اہل علم نے اس شہر کو اپنا مسکن بنانا شروع کیا۔ پھر وہ زمانہ آیا کہ اسلامی دنیا کے بڑے بڑے علماء، فلسفی، مفکر، فقیہہ یہاں جمع ہوئے۔ امام ابو حنیفہ، امام حنبلؒ، امام کاظمؒ اور امام غزالیؒ جیسے لوگوں نے یہاں علم کی روشنی پھیلائی اور غوث الاعظم شیخ عبدالقادر جیلانیؒ جیسی روحانی شخصیات نے علم کی اس شمع کو بجھنے نہ دیا۔

بغداد میں علم کے خزانے جمع ہونے لگے۔ کتب خانے قائم ہوئے جو کتابوں سے بھرتے گئے۔

جب علم عام ہوا تو علماء نے مناظرے کرنے کا بندوبست شروع کر دیا۔ ایک دور ایسا آیا کہ شہر میں ہر طرف علماء مناظرے کرتے اور ایک دوسرے سے دست و گریباں ہوتے

دیکھے جاتے تھے۔ان ہی مناظروں میں کئی لوگ پھانسی کے پھندوں تک پہنچے۔امام حنبل جیسے فقیہہ کو کوڑے کھانے پڑے۔

یہ سلسلہ یوں ہی چلتا رہا۔

آخر وہ وقت آیا جب ہلاکو خان نے 1260ء میں بغداد کی اینٹ سے اینٹ بجائی۔شہر کو آگ لگا کر راکھ کیا۔علماء قتل ہوئے۔کتب خانوں کو آگ لگا دی گئی۔جو کتابیں آگ سے بچ گئیں۔انہیں دریائے دجلہ میں پھینک دیا گیا۔

دریائے دجلہ کے کنارے اتنے قتل ہوئے کہ بہت عرصہ دریا کا پانی سرخ رنگت میں بہتا رہا۔ہلاکو نے اسی دریا کے کنارے انسانوں کے سروں کا مینار تیار کیا تھا۔آج میں اسی دریائے دجلہ کے کنارے اسی تباہ حال شہر بغداد کو دیکھنے آیا تھا۔لیکن یہ صدیوں پرانی تباہی نہیں تھی۔یہ وہ تباہی تھی جو انسان کے بنیادی حقوق کے بزعم خود سب سے بڑے علم بردار ''گلوبل ولیج'' کے چوہدری امریکہ بہادر کے ہاتھوں آج سے دس سال پہلے یہاں بپا ہوئی تھی۔یہاں کے نہتے شہریوں کا قتل عام ہوا تھا۔پل توڑے گئے تھے اور عمارتوں پر بم برسا کر اہل بغداد کو ہلاکو خان کے مظالم یاد دلائے گئے تھے۔

میں ان ہی سوچوں میں غرق تھا کہ فون کی گھنٹی بجی۔میں خیالوں کی دنیا سے نکل کر حقیقت میں لوٹا اور کمرے میں جا کر فون اٹھایا۔دوسری طرف حاجی کرامت صاحب تھے۔آواز آئی:

''نظامی صاحب!

تیار ہو کر ناشتہ کے لئے ڈائننگ ہال میں تشریف لائیے۔''

میں نے جی ہاں کہہ کر فون رکھا۔

اٹھ کر غسل کیا،کپڑے بدلے اور اپنی ڈائری،قلم اور کیمرہ لیکر ہوٹل کے ڈائننگ ہال میں ناشتہ کی میز پر جا پہنچا۔

ناشتہ کی میز پر میری ملاقات ابوسعد سے ہوئی جو عراق میں ہمارے میزبان تھے۔

سعد بھلے وقتوں میں عراقی ائرلائن کے کنٹرول روم میں ایک اعلیٰ عہدہ پر فائز ہوا کرتے تھے۔ لیکن اب تو عراق پر پرواز کرنا ہی ممنوع ہے۔ اس صورت حال میں وہ سیاحوں کی میزبانی نہ کریں تو اور کیا کریں؟

سعد نے بتایا کہ ناشتہ کے بعد ہم بغداد کی زیارتیں کریں گے۔ میں نے زیارتوں کی خوشی میں جلدی جلدی ناشتہ کیا اور گاڑی میں جا بیٹھا۔ سعد کے علاوہ گائیڈ ابومریم بھی گاڑی میں سوار ہو گیا۔ گائیڈ نے اعلان کیا کہ سب سے پہلے ہم غوث الاعظم شیخ عبدالقادر گیلانی" کے مزار پر حاضری دیں گے۔ یہ سنتے ہی میں سوچنے لگا کہ شیخ عبدالقادر گیلانی" تو بڑی عظیم ہستی ہیں۔ ہم نے بچپن میں پڑھا تھا کہ جب وہ حصول تعلیم کی غرض سے گھر سے بغداد روانہ ہوئے تو ماں نے خرچ کے لئے چالیس اشرفیاں دیں اور نصیحت کی کہ:

"بیٹے ہر حال میں سچ بولنا۔ سچ کے سوا کچھ نہ بولنا۔"

ماں نے اپنے لختِ جگر کو بغداد جانے والے ایک قافلے کے ساتھ لگا دیا۔ قافلہ بغداد کی طرف سفر کر رہا تھا کہ راستے میں چوروں نے آن گھیرا۔ چوروں نے قافلے والوں کو حکم دیا کہ جو کچھ آپ کے پاس ہے وہ سب کچھ ہمارے حوالے کرو۔ چور جب اس ننھے منے بچے کے پاس آئے تو پوچھا: "آپ کے پاس کیا ہے؟"

بچے نے جواب دیا: "میرے پاس چالیس اشرفیاں ہیں۔"

چوروں نے پوچھا: "وہ کہاں ہیں۔"

لڑکے نے جواب دیا: "میرے سامان میں رکھی ہوئی ہیں۔"

چوروں نے سامان کی تلاشی لی تو وہاں سے انہیں چالیس اشرفیاں ملیں۔

چور بچے کو پکڑ کر سردار کے پاس لے گئے اور سارا ماجرا بیان کیا۔

سردار نے پوچھا کہ تم نے کیوں بتایا کہ تمہارے پاس چالیس اشرفیاں ہیں جبکہ

ہمیں ان کا علم نہیں تھا۔

بچے نے جواب دیا: ''مجھے چلتے وقت ماں نے نصیحت کی تھی کہ:

''بیٹے سچ بولنا اور سچ کے سوا کچھ نہ بولنا۔''

چوروں کا سردار یہ سن کر سخت حیران ہوا اور بچے کی سچائی دیکھ کر اسی دن سے چوری چکاری سے توبہ کی۔

جب میں یہ سوچ رہا تھا عین اس وقت حاجی غنی آف رادھرم نے اونچی آواز میں کہا:

''نظامی صاحب! میں نے گیارھویں والی سرکار (غوث الاعظم شیخ عبدالقادر گیلانی ؒ) کے نام ایک بکرے کی نیاز مانی ہوئی ہے۔ یہ نیاز مجھے ہر صورت دینی ہے۔ اس مقصد کے لئے اگر بکرا مجھے چوری بھی کرنا پڑے پھر بھی میں باز نہیں آؤں گا۔''

بکرا چوری کر کے غوث الاعظم شیخ عبدالقادر گیلانی ؒ کے دربار پر قربان کرنے کے جذبہ پر میں مسکرا دیا۔

بریڈفورڈ اور گرد و نواح کے مسلمانوں نے 1999ء میں آواز ایف ایم ریڈیو رمضان کی عراق اپیل پر ایک خطیر رقم جمع کی تھی۔ اس رقم کو انتظامیہ کے فیصلہ کے تحت ایک وفد کے ذریعے عراق پہنچانا تھا۔ چنانچہ حاجی کرامت حسین، الحاج یونس اویسی، حاجی خواجہ عبدالرشید، حاجی شاہپال، حاجی رحمان، حاجی ظہور آرٹسٹ اور میری یہ ذمہ داری لگائی گئی تھی کہ ہم یہ فریضہ انجام دیں۔ ہم اسی فریضہ کی انجام دہی کے سلسلہ میں بغداد آئے تھے اور اپنے ذاتی خرچ پر سفر کر رہے تھے۔

حاجی نذیر حسین صاحب نے ہدایت کی تھی کہ عطیات دیتے وقت بغداد میں پاکستانی سفارت خانہ کے کسی آفیسر کو بھی ساتھ شامل کر لینا چاہئے۔ چنانچہ ہمارے رابطے پر راجہ اقبال صاحب جن کا تعلق آزاد کشمیر کے علاقہ کھوئی رٹہ سے ہے ہمارے ساتھ آ شامل

ہوئے۔راجہ اقبال فوج میں کپتان تھے۔ریٹائرڈ ہونے کے بعد اب وہ یہاں کے پاکستانی سفارت خانہ میں کام کرتے ہیں۔

شیخ عبدالقادر گیلانیؒ

عبدالقادر گیلانی کا مزار دریائے دجلہ سے تقریباً ایک میل کے فاصلہ پر پرانے شہر میں واقع ہے۔سب سے پہلے ہم انتظامیہ کے دفتر گئے۔دفتر میں داخل ہوئے تو گدی نشین سید احمد الگیلانی اور انکے چھوٹے بھائی عبدالرحمان الگیلانی نے ہمارا استقبال کیا اور ہمیں اپنے دفتر لے گئے۔ہم نے دونوں گدی نشین بھائیوں کا سرسری جائزہ لیا تو طبیعت خوش ہوگئی۔

پانچ فٹ سات انچ قد کے،سفید رنگ کے،کلین شیو سوٹڈ بوٹڈ،انگریزی میں فر فر باتیں کرتے میں نے کسی پیر کو پہلی بار دیکھا!

اور

وہ بھی پیروں کے پیر غوث الاعظمؒ کے سجادہ نشینوں کو۔

اہالیان بریڈفورڈ کے عطیات جو پچاس ہزار ڈالر تھے۔غوث الاعظمؒ کے سجادہ نشینوں کے حوالے کیے۔سید احمد گیلانی نے خزانچی کو بلایا جس نے مشین کے ذریعے ڈالروں کی گنتی کروا کر رسید لکھ دی تاکہ سند رہے۔

ہماری تواضع چائے سے کی اور پھر غوث الاعظم شیخ عبدالقادر الگیلانیؒ کے مزار کی ایک چادر کا تحفہ اہالیان بریڈفورڈ کے لئے دینے کا وعدہ کیا جو بعد میں پورا کر دیا گیا۔

یہاں سے فارغ ہوئے تو سید احمد الگیلانی نے اپنے چھوٹے بھائی عبدالرحمان الگیلانی کی ڈیوٹی لگائی کہ وہ ہمیں دربار پر دعا کے لئے لے جائے اور پھر لنگر خانہ دکھائے کہ ہم کھانا کس طرح تیار کر کے غریبوں میں تقسیم کرتے ہیں۔چنانچہ ہم عبدالرحمان الگیلانی کی قیادت میں روضے پر گئے۔

غوث الاعظم شیخ عبدالقادر الگیلانیؒ کا روضہ مسجد کے ساتھ بائیں طرف ہے۔

جوں ہی مسجد میں داخل ہوں روضہ سامنے نظر آتا ہے۔ روضے کا کمرہ تیس فٹ چوڑا اور تیس فٹ لمبا ہوگا۔ قبر پانچ فٹ اونچی ہے۔ اوپر خوشبو سے معطر سبز چادریں ہیں۔ روضہ انتہائی خوبصورت ہے۔ اندرونی دیواروں پر شیشہ ہی شیشہ اور چھت پر فانوس نصب ہیں۔

مجھے رابعہ اقبال صاحب نے بتایا کہ روضے کی جالی پاکستان سے تیار ہو کر آئی تھی۔

پاکستان اور بھارت کے لوگ انہیں غوث الاعظم شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کہتے ہیں۔ جبکہ اہل عراق اور گدی نشین انہیں گیلانی کہتے ہیں۔ سنا ہے ان کے آبائی گاؤں کا نام گیلان تھا۔ جس کی مناسبت سے یہ الگیلانی کہلواتے ہیں۔

غوث الاعظم شیخ عبدالقادر الگیلانیؒ کے مزار کی جگہ مدرسہ تھا جہاں وہ 1165ء یعنی اپنی وفات تک پڑھاتے رہے تھے۔ انہوں نے اپنی زندگی میں ہی غریب لوگوں کے لئے لنگر جاری کر دیا تھا جو اب تک جاری ہے۔

غریبوں کو کھانا کھلانے کی وجہ سے اہل بغداد انہیں بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ میرے خیال میں غوث الاعظمؒ کی اس سے بڑی کوئی اور جیتی جاگتی کرامت نہیں کہ غریب لوگ گذشتہ ایک ہزار سال سے بلا ناغہ ان کے لنگر سے کھانا کھاتے ہیں۔ اس جیتی جاگتی کرامت کے مقابلے میں ڈوبے ہوئے بیڑے کو بارہ برس بعد باہر نکالنے والی بات بے وزن محسوس ہوتی ہے۔

دربار کے بعد ہمیں لنگر خانہ دکھایا گیا۔ جہاں اس وقت بڑی بڑی دیگوں میں کھانا تیار ہو رہا تھا۔ ہمیں بتایا گیا کہ اس بڑی دیگ میں سو کلو گوشت یا دو سو کلو چاول پکائے جاتے ہیں جو پانچ سو آدمیوں کے کھانے کے لئے کافی ہوتے ہیں۔

زیارت کے بعد جب ہم دربار سے باہر نکلے تو مانگنے والے ہم پر یوں ٹوٹ پڑے جس طرح حالیہ جنگ میں امریکہ عراق پر ٹوٹ پڑا تھا۔ اگر آپ مانگنے والوں کے سامنے جیب میں ہاتھ ڈال دیں تو پھر آپ کو پیدل چلنے کی ضرورت پیش نہیں آتی مانگنے والے خود ہی

آپ کو اٹھائے پھریں گے اور جب چھوڑیں گئے تو آپ کی جیبیں خالی اور کپڑے پھٹے ہوئے ہوں گے۔

بابا زیارت قبول

"بابا زیارت قبول"

"ما غریب"

ایسے فقرے آپ کو زیارتوں کے دوران اکثر سننے کو ملتے ہیں۔اگر آپ مانگنے والوں کو نہیں دیں گے تو بعض اوقات بات لڑائی جھگڑے اور گالی گلوچ تک پہنچ جاتی ہے۔میں آپ کو آنکھوں دیکھا حال سناتا ہوں۔

حاجی کرامت حسین نے گائیڈ ابومریم کو اہالیان بریڈفورڈ کے عطیات میں سے کچھ پیسے دیئے تاکہ غربا میں تقسیم کیے جاسکیں۔ابومریم نے خوشی خوشی اس فریضہ کو انجام دینے کی حامی بھری۔لیکن جب عوام الناس کو یہ پتہ چلا کہ یہاں پیسے تقسیم ہو رہے ہیں تو شہر کا شہر امنڈ آیا۔مانگنے والوں نے ابومریم پر ہلہ بول دیا۔اس ہنگامے میں لوگوں نے نہ صرف صدقات کے پیسے چھین لئے بلکہ کھینچ کھینچ کر بے چارے کی پتلون بھی اُتار دی۔شکر ہے اس نے جانگیہ پہنا ہوا تھا ورنہ.............!

میں نے دیکھا بے چارہ ایک جانگیہ پہنے گریباں چاک کہہ رہا تھا:

"یا حاجی کرامت حسین!میں نہ صرف پتلون سے محروم ہوا بلکہ آپ نے جو دو سو ڈالر خریداری کے لئے دیئے تھے۔اُن سے بھی محروم ہو گیا۔"

حاجی صاحب کو ابومریم پر ترس آیا اُسے ساتھ لیا اور بازار سے نئی پتلون خرید کر دی۔

اس واقعہ سے میں نے یہ سبق سیکھا کہ اگر ان مزاروں پر مساکین کو صدقات تقسیم ہی کرنے پڑیں تو پھر جین کی مضبوط پتلون کے اوپر مضبوطی سے بیلٹ باندھ کر یا پھر پہلوانی لنگوٹ باندھ کر اس میدان میں اترنا چاہئے۔شلوار قمیض میں بھول کر بھی یہ فریضہ مت ادا کیجئے۔

غلطی معاف ہو تو عرض کرتا چلوں کہ مزاروں پر پیشہ ور مانگنے والوں کے ساتھ ساتھ معزز مانگنے والوں کا بھی تانتا بندھا رہتا ہے۔ سچی بات یہی ہے کہ بے چارے پیشہ ور مانگنے والوں سے یہ معزز مانگنے والے زیادہ کماتے ہیں۔ جو مزاروں پر گدھوں کی طرح اِدھر اُدھر شکار کی تلاش میں گھومتے رہتے ہیں اور کسی نہ کسی حوالے سے مزار سے اپنا رشتہ جوڑ کر معزز طریقے سے لوٹتے ہیں۔ نہ صرف لوٹتے ہیں بلکہ بعض اوقات کپڑے تو کیا یہ ظالم چمڑی بھی اُتار لیتے ہیں۔ عام پیشہ ور مانگنے والے تو مفت میں بدنام ہیں۔

امام کاظمؒ کا مزار

غوث الاعظم شیخ عبدالقادر گیلانیؒ کے دربار سے نکل کر ہم امام کاظمؒ کے مزار پر حاضر ہوئے۔ یہ مزار انتہائی خوبصورت ہے۔ دیواروں پر شیشہ اور فانوس لگے ہوئے ہیں۔ اس دربار پر اہل تشیع حضرات کی اکثریت دیکھی۔ زائرین ایران اور دوسرے دور دور کے علاقوں سے سفر کر کے یہاں آئے تھے۔

میں نے ایک آدمی کو دیکھا جس نے اپنے آپ کو دربار کے ساتھ باندھا ہوا ہے ممکن ہے اس کی کوئی مراد یا منت ہو۔ یہاں بھی جالیوں کے ساتھ میں نے تالے اور کپڑے بندھے ہوئے دیکھے۔

غوث الاعظمؒ کی مسجد کے مؤذن شیخ عمر جنہوں نے خود ہی ہماری راہنمائی کا فریضہ سنبھالا ہوا تھا۔ جب امام کاظمؒ کے دربار پر پہنچے تو دربار کے منتظم کو گلے لگا کر یہ ثابت کیا کہ شیعہ سنی بھائی بھائی ہیں۔ غوث الاعظم شیخ عبدالقادر گیلانیؒ کے دربار پر مجھے جھنگ پاکستان کے ایک صاحب ملے جن کے ساتھ ان کی بیگم بھی تھیں۔ اس نے مجھے بتایا کہ وہ جس قافلے کے ساتھ آئے ہیں اس میں اکثریت شیعوں کی ہے۔ جنہوں نے اہل تشیع کے تمام مزارات پر حاضری دی۔ لیکن جب سنی مزاروں کی باری آئی تو......

وہ بھاگ گئے۔

حتیٰ کہ وہ ان کے ساتھ یہاں غوث الاعظم شیخ عبدالقادر الگیلانی کے دربار پر بھی نہیں آئے۔ جب وہ مجھے یہ بتا رہے تھے تو میں سوچ رہا تھا کہ میرا یہ بھائی یہاں بھی وطن عزیز کی طرح شیعہ سنی کے درمیان نفرت کے بیج بونے میں مصروف ہے۔

امام ابوحنیفہؒ کا مزار

نماز ظہر کے وقت ہم امام ابو حنیفہؒ کے مزار پر حاضر ہوئے۔ امام صاحبؒ کا مزار سادہ لیکن پر وقار ہے۔ مزار مسجد کے اندر ہے۔ قبر کے اردگرد لکڑی کی جالی ہے۔ قبر پانچ فٹ اونچی ہوگی۔ جب ہم دعا مانگ رہے تھے تو خالہ گلزار بسم اللہ بسم اللہ پڑھتی اپنی چادر سے دربار کی جالیاں صاف کر رہی تھیں۔ یاد رہے کہ خالہ نے یہ فریضہ ہر دربار پر باقاعدگی کے ساتھ ادا کیا تھا۔

مزار پر حاضری کے بعد ہم دربار کے انچارج ڈاکٹر الشیخ عبدالغفار ایم ٹی ایل قاسی کے دفتر میں گئے جو مسجد کے اندر ہی واقع ہے۔ ڈاکٹر صاحب ہم سب سے مل کر بہت خوش ہوئے۔ میں نے برطانیہ کے مسلمانوں کی طرف سے ایک مختصر تقریر میں انہیں نیک خواہشات کے پیغام دیئے، جس کے جواب میں ڈاکٹر صاحب نے خطاب فرمایا:

> "ہم آپ کو امام ابوحنیفہؒ کے دربار پر خوش آمدید کہتے ہیں۔ عراق پاک سرزمین ہے جہاں شہدائے کربلا، حضرت علیؑ، امام ابوحنیفہؒ، امام حنبلؒ جیسے نیک لوگوں اور پیغمبروں کے مزارات ہیں۔ حالیہ جنگ میں امریکہ نے تیس ممالک کے اتحاد سے ہم پر بمباری کی۔ امریکہ نہیں چاہتا کہ عراق قائم رہے لیکن بزرگوں، نیک اور صالح لوگوں کی برکات سے امریکہ اپنے مشن میں ناکام رہا۔ ہم کہتے ہیں کہ الحمدللہ عراق دنیا کے تمام مسلمانوں کے لئے ہے۔ عراقی صدر صدام حسین تمام اسلامی ملکوں اور زیارات کی حفاظت کرتا ہے۔ اللہ کا فضل ہے کہ ہم دنیا کے کسی بھی ملک سے نہیں ڈرتے۔ ہم پیغمبروں کے قانون پر عمل کرتے

ہیں۔ اسلام کی وجہ سے آپ ہمارے بھائی ہیں۔ آپ سب امام ابو حنیفہؒ کے ماننے والے ہیں اور غوث الاعظم شیخ عبدالقادر گیلانیؒ کے عقیدت مند ہیں۔ خدا آپ کو، آپ کے ملک کو اور آپ کے بہن بھائیوں اور رشتہ داروں کو اسلامی اخوت کی لڑی میں پرو دے۔ تمام اسلامی ملکوں کی ہمدردیوں اور دعاؤں سے ہم نے دشمن کو شکست دی ہے۔ جنہوں نے امریکہ کی حمایت کی وہ منافق ہیں۔ آپ سب کا بہت بہت شکریہ۔"

خطاب کے بعد ڈاکٹر صاحب نے وفد کو امام ابو حنیفہؒ کے مزار کی ایک چادر پیش کی۔ ہم نماز ظہر ادا کر کے یہاں سے روانہ ہوئے۔

شیخ جنید بغدادیؒ کا مزار

نماز ظہر کے بعد ہم شیخ جنید بغدادیؒ کے مزار پر حاضر ہوئے۔ یہ مزار پرانے شہر کی کچی آبادی میں قدرے ویران علاقہ میں واقع ہے۔ راستہ بالکل کچا اور پیدل چلتے وقت خاک اڑتی تھی۔ ہمارا قافلہ چلتا ہوا ایک بڑے گیٹ سے اندر داخل ہوا جہاں کھلے دالان میں سبزیاں اور کھجور کے درخت تھے۔ جن کی تازہ کھجوریں بچے وہاں فروخت کر رہے تھے۔ جب ہم وہاں پہنچے تو مزار بند تھا۔ ہمیں دیکھ کر قریبی مکان سے ایک صاحب آئے انہوں نے دروازہ کھولا اور ہمیں زیارت کا موقع دیا۔ مزار پر وقار ہے۔ صفائی کا انتظام بھی اچھا ہے۔ مقبرے کے باہر ایک بورڈ آویزاں ہے جس پر لکھا ہوا ہے کہ:

"مرقد شیخ الجنید بغدادی قدس اللہ سرہ العزیز"

کتابوں میں پڑھا اور بزرگوں سے سنا تھا کہ شیخ جنیدؒ اپنے زمانے میں شاہی پہلوان تھے اور کبھی کسی پہلوان سے شکست نہیں کھائی تھی۔ لیکن جب اللہ نے ان پر کرم خاص کیا تو ایک دن ایک غریب اور ناتواں سید زادے کی فریاد سنتے ہوئے اہل سادات کی عزت و تکریم کی خاطر جان بوجھ کر کشتی لڑتے ہوئے شکست کھائی۔ اس شکست نے ان کی دنیا ہی

بدل دی۔ سنا ہے زمین پر گرتے ہی اللہ تعالیٰ نے ان پر اپنے کچھ مخفی راز افشا کر دیئے۔ جن کی جھلک پاتے ہی انہوں نے پہلوانی اور دنیاوی چمک دمک کو ہمیشہ کے لئے خیر باد کہہ کر فقر کی دنیا اختیار کر لی۔ جہاں فقر کی منزلیں طے کرتے کرتے اُس مقام پر پہنچے کہ لوگ شیخ الجنیدؒ کو تصوف کا بادشاہ ماننے لگے۔

اتفاق کچھ ایسا ہوا کہ اس مزار پر ہمارے کسی ساتھی نے پیسے نہ دیئے۔ چنانچہ فاتحہ خوانی کے بعد جب ہم باہر نکلے تو روضے کے جس متولی نے ہمارے لئے دروازہ کھولا تھا اُس نے ہمیں گالیاں دینی شروع کر دیں۔

اس پر غوث الاعظم الگیلانیؒ کے مزار کے مؤذن شیخ عمر نے، جو صبح سے ہمارے ساتھ رضا کارانہ سروس فراہم کر رہے تھے، جوابی حملہ کیا اور یوں دو طرفہ تبرہ بازی شروع ہو گئی۔

ہمارے زیارتی ساتھیوں میں سے کوئی عربی نہیں سمجھتا تھا چنانچہ ہم سب یہی سمجھتے رہے کہ متولی ہمیں دعائیں دے رہا ہے۔

لیکن جب تیور دیکھے تو ہم پر حقیقت کھلی۔

ایک ولی کے مزار کے متولی کو جب گالیاں نکالتے دیکھا تو مجھے اپنے گاؤں کا ''سائیں جھلا'' یاد آیا جو ہر کسی کو بری بری گالیاں دیا کرتا تھا۔ لیکن گاؤں کے سیانے ہمیں کہا کرتے کہ بیٹے یہ سائیں جھلا جسے گالیاں دیتا ہے اس کا بیڑا پار ہو جاتا ہے۔ اس لئے سائیں لوگوں کی گالیوں پر غصہ کی بجائے خوش ہونا چاہئے۔

میں بزرگوں کی اس نصیحت کے مطابق خاموش بلکہ خوش تھا۔

لیکن

ہمارے شیخ عمر بڑے سیخ پا ہو رہے تھے۔

شیخ جنیدؒ کے متولی کی رفتار ہمارے شیخ سے تیز تھی اس لئے یہ بازی اُسی نے جیتی۔ شیخ عمر اس محاذ سے شکست کھانے کے بعد راستہ بھر منہ لٹکائے بار بار ہونٹوں پر زبان پھیرتے اور فریادی نظروں سے ہمیں دیکھتے رہے۔

نبی اللہ یوشع بن نونؑ

جنید بغدادیؒ کے مزار کے قریب ہی نبی اللہ حضرت یوشع بن نونؑ کا مزار ہے۔ہم نے ابھی تازہ گالیاں کھائی تھیں اس لئے بدمزگی سی تھی۔اگرچہ ہم نے شیخ عمر کا مورال بلند کرنے کی کوشش کی تھی لیکن شکست کھانے سے اُن کے چہرے سے ندامت عیاں تھی۔جسے چھپانے کے لئے وہ بار بار ہونٹوں پر زبان پھیرتے تھے لیکن جو ہونا تھا وہ ہو چکا تھا۔

نبی اللہ یوشع بن نونؑ کا مزار انتہائی خستہ حالت میں ہے۔یہاں کوئی مجاور بھی نہیں دیکھا۔مجھے یہ تو پتہ ہے کہ بغداد 762ء کے بعد تعمیر ہوا لیکن یہ معلوم نہ کر سکا کہ اس سے قبل بھی یہاں کوئی آبادی تھی یا نہیں۔اگر حضرت یوشعؑ کا یہاں مزار ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ یہاں آبادی تھی۔اگر آبادی نہیں تھی تو کیا نعوذ باللہ یہ مزار بھی کسی نے نظریہ ضرورت کے تحت روٹی پانی چلانے کے لئے قائم کیا تھا۔

بعض روایات کے مطابق حضرت یوشع بن نونؑ کی قبر بیت المقدس کے قریب عورتا نامی گاؤں کی ایک غار میں واقع ہے۔لیکن یہاں بغداد میں مزار کے باہر ایک بورڈ لکھا ہوا ہے:

''حضرت یوشعؑ بن نونؑ بن افرائینؑ بن یوسفؑ بن یعقوبؑ بن اسحاقؑ بن ابراہیمؑ''

حقیقت کیا ہے وہ اللہ تعالیٰ بہتر جانتے ہیں۔

نبی اللہ حضرت یوشعؑ کے مزار کے ساتھ ہی الشیخ بہلول بن عمر کا مزار بھی ہے۔ہم نے وہاں فاتحہ پڑھی اور ساتھیوں نے گالیوں کے ڈر سے چندہ بھی دیا۔یہاں ساتھ ہی وہ کمرہ بھی موجود ہے جہاں سکھ مذہب کے بانی بابا گرونانک نے شیخ بہلول بن عمر سے ملاقات کی تھی۔اب اس کمرہ میں یادگار کے طور پر گرنتھ صاحب رکھا ہوا ہے۔

امام احمد بن حنبلؒ کا مزار

دوپہر کے کھانے کے بعد ہم امام احمد بن حنبلؒ کے مزار پر گئے۔امام صاحب کا مزار پرانے شہر کے ایک خستہ حال علاقہ میں ہے۔علاقہ انتہائی گندہ اور تاریک تھا۔سڑکیں ٹوٹی ہوئی تھیں اور گڑھے پڑے تھے۔لوگ غریب تھے۔مزار ایک گلی میں اندر کی طرف واقع

ہے۔ جب ہم وہاں پہنچے تو دروازہ بند تھا۔ شیخ عمر نے دوڑ دھوپ کر کے کنجی بردار کو ڈھونڈ نکالا۔ دروازہ کھلا تو مجھے بڑا رنج ہوا۔ یہ واحد مزار تھا۔ جہاں قبر کی بجائے ایک گڑھا تھا۔ متولیوں نے اُسی گڑھے پر سبز چادر ڈالی ہوئی تھی۔ اندر اندھیرا اور ایک عجیب قسم کی ویرانی تھی۔ میرے بار بار پوچھنے پر متولی نے بتایا کہ مزار کا تعمیراتی کام شروع ہونے والا ہے۔ عنقریب مزار بن جائے گا۔ ممکن ہے بن جائے۔ لیکن مجھے تو وہ زندگی بھر اسی خستہ حالی میں نظر آئے گا۔ مزار دیکھا تو مجھے فارسی کا وہ شعر بڑی شدت سے یاد آیا کہ:

بر مزار ما غریباں نے چراغ نے گلے
نے پر پروانہ سوزد نے صدائے بلبلے

شام کا کھانا

شام کا کھانا ہم نے دریائے دجلہ کے کنارے ''المدٰیف فش'' ریسٹورنٹ میں کھایا۔ ریستوران ایک کھلے ہال پر مشتمل تھا جس کے ایک طرف بیٹھنے کے لئے کرسیاں تھیں۔ دوسری طرف دو بڑے بڑے تالاب تھے جن میں ''قتان'' نام کی مچھلی' جو صرف دریائے فرات میں پیدا ہوتی ہے' تیرتی نظر آئی۔

سعد نے ہمیں تالاب کے پاس کھڑا کر کے کہا ''اپنی اپنی مچھلی کا انتخاب کرو۔'' ہم جس مچھلی کی طرف اشارہ کرتے ہوٹل کا خدمت گار فوراً اُسے پکڑ کر زمین پر دے مارتا۔ مچھلی تڑپ کر مر جاتی۔ وہ صاحب چاقو لیکر مچھلی کا سینہ چاک کرتے اور پھر اس مچھلی کو آگ کے ایک بڑے الاؤ کے پاس اس طرح کھڑی کرتے کہ مچھلی کا رخ آگ کی طرف ہوتا۔ اسی طرح ریسٹورنٹ کے ملازم مچھلیاں پکڑ پکڑ کر آگ میں لگاتے جاتے تھے۔

آگ کا یہ الاؤ لکڑیوں کا تھا جس میں ایک خاص قسم کی موٹی موٹی لکڑی استعمال کی جا رہی تھی۔ کچھ دیر مچھلی یوں ہی آگ میں پکتی پھر اسے اٹھا کر اس میں مرچ مصالحے لگا کر اسے بند کر کے آگ کے انگاروں کے نیچے رکھ دیتے تھے۔ جب مچھلی تیار ہو جاتی تو اسے ایک بڑے تھال میں رکھ کر سلاد اور طرح طرح کی چٹنیوں کے ساتھ پیش کرتے۔

ہم نے مچھلی کھائی تو مزا آ گیا۔

سعد سے بات چیت

جب ہم لذیذ مچھلی کھا رہے تھے اس وقت مجھے عراق کے وہ لاکھوں غریب لوگ یاد آئے جن کے بارے میں خیال ہے کہ وہ بھوکے مر رہے ہیں۔ میرے ساتھ سعد بیٹھے ہوئے تھے۔ سعد عراق میں ہمارے میزبان ہیں اور عراقی لوگوں کی حالت سے اچھی طرح واقف ہیں۔ چنانچہ موقع کی مناسبت سے میں نے پوچھ ہی لیا کہ بھائی ذرا اصل حقائق بتاؤ کہ کیا واقعی عراقی لوگ بھوکے مر رہے ہیں؟

سعد مسکرایا اور عرب کے روائتی جوش و جذبہ کے عالم میں مجھ سے مخاطب ہوا:

''یا سیدی الشیخ یعقوب نظامی!

حقیقت یہ ہے کہ:

ہم دنیا کے پہلے ملک ہیں جن کے پاس آئیل ریفائنری کمپنی تھی۔ ہمارا شمار دنیا کے امیر ملکوں میں ہوتا تھا۔ اس ملک میں دریائے دجلہ اور فرات بہتے ہیں جس کی وجہ سے یہ زرعی ملک ہے۔ عراقی عوام اپنے صدر صدام سے پیار کرتے ہیں۔ ہم دنیا کے واحد ملک ہیں جس نے امریکہ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کی اور امریکہ اور اسرائیل سے جنگ لڑی۔ ہمارے ملک میں ہر چیز موجود ہے۔ ہمارا ملک پاکستان، سعودی عرب اور شام جیسے ملکوں سے بہتر ہے۔ عالمی پابندیوں کے باوجود ہم دس سال سے زندہ ہیں' ہم مزید بیس سال اور زندہ رہ سکتے ہیں۔ امریکہ نے ہماری سڑکیں، پل اور شہر کے بیشتر حصہ کو تباہ کر دیا تھا ہم نے انہیں دوبارہ تعمیر کیا۔ عراق کی آبادی 22 ملین ہے۔ جنگ سے قبل بیرون ملک کے لوگ ہمارے ہاں کام کرتے تھے۔ یہاں صرف مصری ہی تین ملین تھے۔ پاکستان، بھارت، بنگلہ دیش اور دوسرے ممالک کے لوگ بھی تھے۔ ہمارے ہاں بیرون ملک کے لوگ انجینئر، ڈاکٹر اور مزدور تھے۔ جنگ میں یہ سب لوگ اپنے

اپنے ملکوں کو واپس چلے گئے۔ جنگ سے قبل عراقی لوگ صرف عیش و
عشرت کی زندگی گزارتے تھے لیکن بیرونی امداد ختم ہونے کے بعد عوام
نے عیش و عشرت کی زندگی ترک کی اور ملکی تعمیر کے لئے اٹھ کھڑے
ہوئے۔ ہم نے اپنی مدد آپ کے تحت تمام پل اور سڑکیں تعمیر کر ڈالیں۔
آپ ملک میں گھوم پھر کر دیکھیں آپ کو جنگ کی وجہ سے کوئی پل،
عمارت یا سڑک ٹوٹی ہوئی نظر نہیں آئے گی۔"

جب میں نے گھوم کر شہر دیکھا تو سعد کی بات سچ معلوم ہوئی صرف ڈیفنس منسٹری کی عمارت ابھی اسی حالت میں ہے باقی سب کچھ ٹھیک کر دیا گیا ہے۔

سعد کی پر جوش باتوں کے بعد میں نے ایک اور صاحب یاسین ابو عمار سے عراقی لوگوں کی معاشی صورت حال معلوم کی تو اس نے بتایا کہ:

☆ اس ملک میں پرائمری سے لیکر یونیورسٹی تک ہر کسی کے لئے تعلیم مفت ہے۔
جنگ کی وجہ سے حکومت نے لوگوں کو رعایتی شرح سے چیزیں دینی شروع کر دی ہیں مثال کے طور پر بجلی، پانی، گیس اور فون کے ایک ماہ کے بل کا صرف ایک ڈالر وصول کیا جاتا ہے۔

☆ ایک ڈالر کا 100 لیٹر ڈیزل یا پٹرول مل جاتا ہے۔

☆ حکومت ہر آدمی کو ہر ماہ ڈھائی کلو چاول، بارہ کلو آٹا، دو کلو شوگر، دو سو گرام چائے اور صابن کی چار ٹکیہ دیتی ہے۔ ان سب چیزوں کے لئے صرف ایک ڈالر وصول کیا جاتا ہے۔

☆ اس کے علاوہ حکومت کبھی کبھی عوام کو گفٹ بھی دیتی ہے۔

☆ ادویات کے علاوہ ہر چیز مارکیٹ سے مل جاتی ہے۔

☆ امریکی پابندیوں کی وجہ سے ادویات نہ ملنے کے باعث ہمارے پانچ ہزار بچے ہر ماہ فوت ہو رہے ہیں۔

☆ اس پابندی سے ہماری کرنسی میں بہت کمی آئی۔ جنگ سے قبل ایک عراقی دینار کے 3.3 ڈالر ملتے تھے لیکن اب ایک ڈالر کے 1900 عراقی دینار ملتے ہیں۔

☆ امریکہ بڑا بدمعاش اور مطلب پرست ہے۔ وہ اسلام اور مسلمانوں کے خلاف ہے۔ ہمارے ساتھ جو کچھ ہوا اسے سب جانتے ہیں۔ افغانستان نے امریکہ کے کہنے پر روس کے خلاف جنگ لڑی لیکن اب امریکہ کا مطلب نکل گیا ہے اس لئے اس نے افغانستان کے خلاف بھی پابندیاں لگا دی ہیں۔"

میں نے آزاد ذرائع کا استعمال کرتے ہوئے ایک سفارت کار سے پوچھا تو اس نے ان باتوں کی تصدیق کی۔ بلکہ اس نے مزید یہ بھی بتایا کہ پورے عرب میں سب سے معزز اور بہتر لوگ عراق کے ہیں۔ یہ ملک زرخیز اور لوگ محنتی ہیں۔

جب میں نے پوچھا کہ کیا واقعی عراق کے لوگ صدام سے پیار کرتے ہیں تو انہوں نے سفارتی لہجہ میں جواب دیا کہ یہ لوگوں کی مجبوری ہے۔ ورنہ خاندانوں کے خاندان ختم کر دیئے جاتے ہیں۔ صدام اگر اپنے دامادوں کے قصور معاف نہیں کر سکتا تو وہ عام آدمیوں کی کوتاہیوں کو کیسے برداشت کر سکتا ہے۔

ہمارے قافلہ کے قائد حاجی کرامت تھے جنہوں نے گذشتہ سال حاجی نذیر حسین کے ہمراہ بوسنیا کا دورہ کیا تھا۔ میں نے حاجی کرامت حسین سے پوچھا کہ عراق اور بوسنیا دونوں میں سے کس کی حالت زیادہ خراب ہے؟

انہوں نے جواب دیا: "بوسنیا" کی۔

بوسنیا میں نہ صرف گھر تباہ کر کے آگ لگائی گئی بلکہ ان کے مردوں اور بچوں کو بے دردی سے قتل کیا گیا۔ بوسنیا میں قحط اور بیماری بہت زیادہ ہے۔ عراق اس لحاظ سے بہتر ہے کہ امریکی بمباری سے عراقی املاک تو تباہ ہوئیں لیکن جانی نقصان نہیں ہوا۔ میرے خیال میں عراقی لوگوں کی حالت پاکستان، بھارت اور بنگلہ دیش کے لوگوں سے بہتر ہے۔"

حاجی کرامت نے ٹھیک تجزیہ کیا۔ میں پانچ دنوں میں بیشتر علاقہ میں گھوما جس میں شہر اور دیہات دونوں شامل ہیں۔ مجھے ایک بھی آدمی نہیں ملا جس کے کپڑے پرانے اور خستہ ہوں۔ میں نے سب لوگوں کو خوش باش، اُجلے کپڑے پہنے اور اچھے اچھے کھانے کھاتے دیکھا۔ رہی بات ادویات کی تو اس وقت یہ صرف عراق کا مسئلہ نہیں بلکہ کئی ترقی پذیر ملک ہیں جہاں لوگ بغیر ادویات کے مر رہے ہیں۔

یاسین عمار

جب ہم عراق میں داخل ہوئے تو سرحد سے ہی حکومت نے ایک صاحب یاسین عمار نامی کو ہمارے ساتھ لگا دیا۔ یاسین عمار محکمہ سیاحت کے ملازم تھے اور ہمارے قیام عراق کے دوران متواتر ہمارے ساتھ رہے۔ یاسین نے پاکستان کے پولیسیوں کی طرح مونچھیں رکھی ہوئی تھیں۔ بلکہ ان کے کرتوت بھی پولیس والوں سے ملتے جلتے تھے۔ سب سے پہلے انہوں نے ہمیں عراق کے بارے میں ایک متروکہ قسم کی گائیڈ فروخت کی جو کوئی بیس سال پہلے مرتب ہوئی تھی۔ اس کے بعد انہوں نے ہمارے ساتھ ہی کھانا پینا شروع کر دیا۔ جب ہم شام کو دریائے دجلہ کے کنارے مچھلی کھانے گئے تو یاسین نے ایک ساتھی کو بھی فون کر کے بلا لیا کہ آؤ مفت کھانا کھاؤ۔

سعد بات سمجھ گیا اور طیش میں آ کر اسے کہا کہ فوراً یہاں سے بھاگ جاؤ ورنہ میں ابھی حکومت کو فون کرتا ہوں۔ شکایت کا سن کر جناب یاسین وہاں سے بھاگ گئے۔ لیکن دوسرے دن پھر آ موجود ہوئے۔

اس کے بعد بھی یہ چھوٹی موٹی غیر اخلاقی حرکتیں کرتے رہے۔ جب ہم خریداری کرتے تو دکان دار سے مل کر ہم سے زیادہ پیسے ادا کرواتے اور بعد میں کمیشن وصول کرتے۔

سعد نے مجھے بتایا کہ ایسا یہاں اکثر ہوتا ہے۔ ایک دن ہم ایک دکان پر گئے دکان دار نے سعد سے کہا کہ ان سے مجھے زیادہ پیسے وصول کرنے دو تو میں آپ کو کمیشن دوں گا۔

یہ سن کر سعد اس سے لڑنے لگے۔ اور کہا: ”تمہیں شرم نہیں آتی کہ سیاحوں کو اور وہ بھی مسلمان بھائیوں کو لوٹتے ہو۔“ پھر مجھے گلے لگا کر اسے کہنے لگا: ”یہ میرا بھائی ہے۔“

یہ کہہ کر اس نے کہا کہ ہم تمہاری دکان سے خریداری نہیں کریں گے۔

دکان دار نے لاکھ معافی مانگی لیکن سعد کے عرب خون نے اُسے معاف نہیں کیا۔

حاجی صاحب کو کھوتی کی ضرورت

ہم ہوٹل میں کھانا کھا رہے تھے کہ حاجی کرامت حسین میرے پاس آئے اور کہا انہیں ایک کھوتی (گدھی) کی ضرورت ہے۔

پہلے پہل میں حاجی صاحب کی اس انوکھی فرمائش پر مجھے سخت حیرت ہوئی۔

یا اللہ خیر!

میں نے ہمدردانہ لہجے میں پوچھا:

"حاجی صاحب! کیا کھوتی کے بغیر بھی کام چل سکتا ہے؟"

حاجی صاحب نے مسکراتے ہوئے کہا: "اگر کھوتی نہیں تو پھر کھوتا (گدھا) ہی سہی۔"

میں نے وجہ پوچھی۔ تو بولے:

"میں نے غلطی سے پانچ سو ڈالر کے عراقی دینار منگوائے ہیں۔ گائیڈ ابو مریم یہ کرنسی ایک ٹیکسی میں لاد کر لایا ہے۔ مجھے پتہ نہیں تھا کہ ایک ڈالر کے 1900 عراقی دینار ملتے ہیں۔ پانچ سو ڈالر کے (9,50,000) نو لاکھ پچاس ہزار دینار ملے ہیں۔ میں اس رقم کو اب کیسے اٹھائے پھروں۔ یہ بوجھ تو ایک کھوتی ہی اٹھا سکتی ہے۔"

میں نے کرنسی کا جائزہ لیا تو وہ بوجھ کھوتی کا نہیں بلکہ خچر کا تھا۔

کرنسی دیکھ کر مجھے محسوس ہوا کہ خلیج کی حالیہ جنگ نے عراقی معیشت پر کتنا برا اثر ڈالا ہے۔ جنگ سے قبل ایک عراقی دینار کے ساڑھے تین ڈالر ملتے تھے اب جنگ کے بعد ایک ڈالر کی مالیت 1900 دینار ہو گئی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ عراق کے عوام اس جنگ کے بعد بری طرح کچلے جا رہے ہیں۔

غوث الاعظم گیلانیؒ کے مزار کا ایک منظر

کھانا کھانے کے بعد جب ہم واپس ہوٹل آئے تو حاجی شاہ پال صاحب کہنے لگے

"نظامی صاحب! کل آپ ہمارے ساتھ غوث الاعظم گیلانیؒ کے مزار پر نہیں گئے تھے۔ اس طرح آپ بہت کچھ دیکھنے اور لکھنے سے محروم ہو گئے۔"

میں نے پوچھا کہ آخر وہ کون سی خاص بات تھی جو میں نہ دیکھ سکا۔

یہ سن کر حاجی شاہ پال نے ویڈیو کیمرہ نکالا اور گذشتہ دن کی فلم چلا دی۔ میں نے فلم میں دیکھا کہ ہمارا قافلہ جب غوث الاعظمؒ کے دربار پر پہنچا تو انتظامیہ نے ان کا بڑی گرم

جوش سے استقبال کیا۔ پھر نماز ادا ہوئی۔ نماز کے بعد محفل سماع کا انتظام ہوا۔

اس موقع پر امام صاحب محراب میں کھڑے تھے۔ انکے دائیں بائیں تین تین معاون تھے۔ نمازی گول دائرے میں اس طرح کھڑے تھے، جیسے ہم سکول میں سبق یاد کرنے کے لئے کھڑے ہوا کرتے تھے۔ سب نے مل کر کلمہ شریف کا ورد شروع کر دیا۔ تھوڑے عرصہ بعد امام صاحب کے دائیں بائیں کھڑے ان کے معاونین نے دف بجانے شروع کر دیے۔ دف کی آواز پر کلمہ طیبہ پڑھتے پڑھتے آہستہ آہستہ جذب کی کیفیت پیدا ہوئی تو امام صاحب کے اشارے پر دف بجانے والوں نے حاضرین کے سامنے جا جا کر دف بجانا اور انہیں جوش دلانا شروع کر دیا۔ انہوں نے ایک چکر مکمل کیا۔ پھر امام صاحب نے تلوار نکالی اور چلنا شروع کر دیا۔ اُن کے پیچھے پیچھے دف بجانے والے تھے۔ امام صاحب ہر آدمی کے سامنے کھڑے ہوتے تلوار اس کی طرف کرتے اور قدم آگے بڑھا دیتے۔ یوں ہی انہوں نے دورہ مکمل کیا۔

اس دوران کافی تعداد میں لوگ وجد کی حالت میں جھومنے لگے۔ میں نے دیکھا۔ جب مسجد میں سارے جھوم رہے تھے، اس وقت ہمارے وفد کے حاجی محمد یونس اویسی میدان میں اُترے۔ انہوں نے ایک آدمی سے دف چھینا اور اُسے بجانے لگے۔ یوں رات گئے تک یہ سلسلہ چلتا رہا۔

تبرکات

بدھ 24 نومبر 1999ء صبح سویرے قافلے کو حضرت غوث الاعظمؒ کے مزار پر دوبارہ حاضری کی دعوت دی گئی تا کہ مزار سے چادر اُتار کر تبرک کے طور پر ہمارے حوالے کی جائے۔ مزار کی چابیاں چار مختلف آدمیوں کے پاس ہوتی ہیں۔ جن کا تعلق مختلف محکموں سے ہے۔ یہ سب مل کر روضے کو کھولتے ہیں۔ یہ طریقہ بالکل بنک لاکر کی طرح کا ہے۔ جب تک بنک منیجر اور کیشئر دونوں جمع نہ ہوں ایک چابی سے لاکر نہیں کھل سکتا۔

ہم دربار پر گئے تو دربار کو عام لوگوں کی آمد و رفت کے لئے بند کر کے صرف ہمارے لئے کھولا گیا۔ ہمارے قافلے کو خصوصی طور پر اندر جانے کی اجازت ملی۔ ہماری موجودگی میں مقبرے کا دروازہ کھلا اور انتظامیہ نے ایک انتہائی قیمتی شنیل کی چادر اُتار کر

ہمارے حوالے کی تا کہ ہم اہالیان بریڈفورڈ کو جا کر دیں۔

چادر ہمارے حوالے کرتے وقت دربار کے سجادہ نشین نے ہمیں خصوصی ہدایت کی کہ ہم چادر کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے آپس میں تقسیم نہ کریں۔ ہمارے کچھ ساتھیوں کا اصرار تھا کہ یہ چادر کاٹ کر اس کے ٹکڑے سب میں بانٹے جائیں۔ لیکن ساتھیوں کی اکثریت اور دربار کے سجادہ نشین کا موقف تھا کہ اسے نہ کاٹا جائے بلکہ اسے اجتماعی قومی امانت سمجھ کر کسی نمایاں جگہ زیارت کے لئے رکھا جائے۔ بعد میں اسی بات پر اتفاق ہوا۔ یہ منظر بڑا دیدنی تھا۔ ہم سب کو دربار کے اندر قبر کو ہاتھ لگانے اور دیکھنے کا موقع ملا۔ مجھے بھی یہ شرف حاصل ہوا۔ مجھے فخر تھا کہ میں اس عظیم بزرگ کے مزار پر حاضر ہوا جس کے دربار سے ایک ہزار سال سے بھوکوں کو بلا ناغہ کھانا ملتا ہے اور جس نے بچپن میں سچ کی قوت سے چوروں کو زیر کیا تھا۔

دربار سے باہر نکلے تو مانگنے والے چھوٹے بڑوں نے گھیر لیا۔ آج ان کی تعداد پہلے سے زیادہ تھی چونکہ گردونواح میں پتہ چل گیا تھا کہ یہاں امیر برطانیہ کا ایک وفد آیا ہوا ہے۔

بغداد سے کوفہ

ہم ساڑھے نو بجے کوفہ کی طرف چل پڑے۔ بغداد شہر سے نکلے تو ہرے بھرے کھیتوں میں کسانوں کو کام کرتے دیکھا۔ پھلوں کے باغات دیکھے۔ بعض جگہوں پر فارم ہاؤس، جنہیں پنجابی میں ''جاگیردار کا ڈیرہ'' کہتے ہیں دیکھے۔ ان فارموں میں گائیں، بھیڑیں، بکریاں اور دوسرے جانور بھی نظر آئے۔ راستے میں ادویات اور بچوں کے لئے فوڈ تیار کرنے والی وہ فیکٹریاں بھی دیکھیں جسے امریکہ بہادر نے بم کا نشانہ بنا کر تباہ کر دیا تھا۔

ہمارے راستے میں کچھ دیہات بھی آئے۔ میں نے محسوس کیا کہ ہر ملک کی دیہاتی زندگی سیدھی سادی ہوتی ہے۔ مکانوں کے اردگرد مرغے مرغیاں اور دوسرے پالتو پرندے بالکل اُسی طرح چرتے نظر آئے جس طرح پنجاب میں نظر آتے ہیں۔

دریائے دجلہ اور فرات کے درمیانی علاقے میدانی اور زرعی ہیں۔ بغداد سے کوفہ، نجف، کربلا سب ان دریاؤں کے کنارے یا قرب وجوار میں آباد ہیں۔ لوگوں کا پیشہ زراعت ہے۔ تمام علاقہ ہموار اور زرخیز ہے۔ دیہاتی پس منظر کے حامل یہ علاقے خودکفیل ہیں۔

ہم اس سرسبز علاقے سے سفر کرتے ہوئے کوفہ کی طرف جا رہے تھے۔ گاڑی میں میرے قریب سعد بیٹھا ہوا تھا جو مجھے تفصیلاً ہر چیز بتا رہا تھا۔ گردونواح کی تفصیلات بتاتے بتاتے سعد اچانک بولا: "وہ دیکھو بابل شہر کے کھنڈرات۔"

میں نے پوچھا کہ کیا ہم وہاں جا سکیں گے؟

سعد نے جواب دیا: "نہیں! یہ ہمارے پروگرام میں نہیں۔" میں نے حاجی کرامت صاحب سے بات کی تو انہوں نے پروگرام میں تبدیلی کی فوری منظوری دے دی۔ لیکن مشکل یہ تھی کہ "زیارتی گروپ" کو بابل کی اہمیت کا کیسے یقین دلایا جائے۔ میں نے سعد سے کہہ کر گاڑی کا رخ بابل کی طرف تبدیل کروا دیا۔ بابل نجف جانے والی شاہراہ سے تھوڑے سے فاصلہ پر ہے۔ ہم کوئی دس منٹ میں بابل پہنچ گئے۔

بابل

بابل کے تاریخی شہر کے کھنڈرات دیکھنے کے لئے ہم اشطار گیٹ سے داخل ہوئے۔ جب شہر آباد تھا تو شہر میں داخل ہونے کا سب سے بڑا دروازہ یہی تھا۔ اس بلند و بالا دروازے کے دونوں طرف جانوروں کی نیلے اور پیلے رنگ میں تصویریں نہایت خوبصورتی سے بنی ہوئی تھیں۔ شہر کے اندر شاہی محلات، وزیروں اور امیروں کے عالی شان مکانات تھے۔ ہم ایک ایسے شہر کے کھنڈرات دیکھ رہے تھے جس کے قصے کہانیوں کی صدائے بازگشت ابھی تک دنیا میں باقی ہے۔ شہر میں داخل ہونے سے پہلے بڑے دروازے کے سامنے ہم نے فوٹو لئے۔ اس کے بعد اندر گئے۔ تو وہاں دائیں بائیں دو عمارتیں دیکھیں۔ باہر کھلا دالان تھا۔ بائیں طرف کی عمارت میں ٹورازم کا دفتر اور گفٹ شاپ تھی اور بائیں طرف کی عمارت میں میوزیم تھا۔ ہم سب گفٹ شاپ میں گئے لیکن میں جلد ہی وہاں سے نکل کر سامنے والی عمارت میں چلا گیا جس میں اب میوزیم قائم ہے۔

ہاروت و ماروت کا کنواں

میوزیم میں ایک کنواں دیکھا جس کے بارے میں روایت ہے کہ یہ ہاروت و ماروت دو فرشتوں کا کنواں ہے۔ کنواں دیکھا تو مجھے یاد آیا کہ 598 قبل مسیح میں بابل کے

بادشاہ نصر نے یروشلم پر حملہ کر کے شہر کو تباہ کرنے کے بعد یہودیوں کے عالم فاضل لوگوں کو قیدی بنا کر بابل میں قید کر دیا تھا۔ یہودیوں کے یہ عالم فاضل یروشلم میں آپس میں دست و گریباں رہتے تھے اور اپنی کرامات اور جادو ٹونوں سے دوسروں کو نیچا دکھانے کی کوششوں میں وقت ضائع کیا کرتے تھے۔ قیدی بن کر بھی انہوں نے عبرت حاصل نہ کی۔ چنانچہ، اللہ تعالیٰ نے ہاروت اور ماروت دو فرشتوں کو انسانی شکل میں ان کے پاس بھیجا۔ لیکن وہ فرشتوں سے بھی جادو ٹونے سیکھنے کی کوشش میں لگ گئے۔ اس قصہ کے بارے میں قرآن پاک کی سورہ البقرہ آیت 102 میں یوں ذکر آتا ہے:

"وہ پیچھے پڑے اس چیز کے جو بابل میں دو فرشتوں ہاروت و ماروت پر نازل کی گئی تھی۔ حالانکہ وہ (فرشتے) جب بھی کسی کو اس کی تعلیم دیتے تھے تو پہلے ہی صاف طور پر تنبیہ کر دیا کرتے تھے کہ "دیکھو ہم محض ایک آزمائش ہیں تو کفر میں مبتلا نہ ہو" پھر بھی یہ لوگ ان سے چیز سیکھتے تھے جس سے شوہر اور بیوی میں جدائی ڈال دیں۔ مگر اس کے باوجود وہ ایسی چیز سیکھتے تھے جو خود ان کے لئے نفع بخش نہیں بلکہ نقصان دہ تھی۔" (القرآن)

539 قبل مسیح میں ایران کے بادشاہ سائرس یا خسرو نے حملہ کر کے بابل پر قبضہ کر لیا تھا۔ سائرس نے یہودیوں کو بابل سے آزاد کیا اور انہیں دوبارہ یروشلم میں جا کر آباد ہونے کی اجازت دی۔

میں میوزیم کا مختصر چکر لگا کر باہر نکلا۔ تو سارے ساتھی واپسی کے لئے بیتاب تھے بعض ساتھی ان کھنڈرات میں اپنا وقت ضائع نہیں کرنا چاہتے تھے۔ پھر بھی میں ظہور کو ساتھ لے کر سیڑھیاں چڑھ کر اوپر گیا تو مجھے دور تک اس شہر کے کھنڈرات دکھائی دیئے۔ بائیں طرف شہر کے اردگرد کی وہ دیوار نظر آئی جو شہر کی حفاظت کے لئے تھی۔ یہ دیوار مٹی اور گارے کی بنی ہوئی تھی۔ دائیں طرف شاہی محلات کے کھنڈرات تھے۔

سکندر اعظم کی وفات

بابل کے ان محلات میں سے ایک محل میں فاتح عالم سکندر اعظم نے اپنی زندگی کے

آخری دن گزارے تھے اور پھر 10 جون 323 قبل مسیح میں یہ فاتح عالم دونوں ہاتھ خالی لیے اس مقام سے ابدی سفر پر روانہ ہو گیا۔

331 قبل مسیح میں سکندر اعظم نے بابل اور ایران کے بادشاہ دارا کو شکست دے کر بابل پر قبضہ کیا تھا۔ قبضہ کرنے کے بعد سکندر مشرق کی طرف فتوحات کرتا ہوا موجودہ پاکستان اور بھارت تک گیا۔ اور پھر 324 قبل مسیح میں واپس بابل آ گیا۔

اب تک بابل کے جو کھنڈرات دریافت ہوئے ہیں۔ ان کے مطابق یہ شہر تقریباً 21 کلو میٹر کے علاقہ میں پھیلا ہوا تھا۔ شہر میں محلات، شاہی تقریبات کے لئے میدان اور فوجی دستوں کے گزرنے کے لئے شاہی راستے تھے۔ ان کے علاوہ عبادت گاہیں، روساء کے مکان اور عام لوگوں کے رہنے کی بستیاں بھی تھیں۔

میں کافی دیر خاموشی سے اس جگہ کا جائزہ لیتا رہا جہاں کسی زمانے میں بادشاہوں کے کروفر، روساء اور وزراء کی جی حضوریاں اور فوجی طاقتوں کے مظاہرے ہوتے رہے ہوں گے۔ آج وہ جگہ لوگوں کے لئے ایک مقام عبرت ہے۔

بابل کے معلق باغات (Hanging Gardens)

بابل کے معلق باغات (Hanging Gardens) یعنی فضا میں لٹکے ہوئے باغات کا شمار دنیا کے سات عجوبوں میں ہوتا ہے۔ مجھے ان باغات کے کھنڈرات کہیں نظر نہ آئے۔ البتہ سعد نے بتایا کہ معلق باغات دریائے فرات کے کنارے ہوا کرتے تھے۔ ان دنوں دریائے فرات شہر کے قریب بہتا تھا۔

معلق باغات کے وجود میں آنے کا سبب کیسے ہوا؟ یہ جاننے کے لئے میں نے ایک مقامی باشندے ڈاکٹر سلام محمد موسیٰ' جو بابل کے قریب ہی حلہ نامی شہر میں سرجن تھے سے پوچھا: ''بابل کے معلق باغات کیوں بنائے گئے؟''

ڈاکٹر موسیٰ نے بتایا کہ:

''بابل کے ایک بادشاہ بخت نصر نے ترکی کی ایک شہزادی سے شادی کی۔ دونوں میں بہت ہی پیار محبت تھا لیکن پھر بھی ملکہ بابل کے محل میں خوش نہیں تھی۔ بادشاہ

نے ملکہ کی پریشانی کی کھوج لگائی تو پتہ چلا کہ ملکہ ترکی کے پہاڑوں اور اُن پر آباد سرسبز باغات کے لئے پریشان تھی۔ چنانچہ ملکہ کی خوشی کی خاطر بادشاہ نے حکم جاری کیا کہ ترکی کے باغات کی طرح یہاں باغات بنائے جائیں۔ اب مسئلہ یہ تھا کہ ترکی میں تو قدرتی پہاڑ تھے جب کہ بابل تو ایک میدان میں آباد تھا۔ چنانچہ ماہرین نے پہلے مصنوعی پہاڑ بنائے اور پھر ان پر باغات لگائے۔ جنہیں دریائے فرات سے پانی دینے کا بندوبست کیا۔ یہ معمہ آج تک ماہرین حل نہ کرسکے کہ بہت بلندی پر بنائے گئے ان باغات کو پانی بغیر کسی مشین یا پمپ کے کس طرح فراہم کیا جاتا تھا۔

جب عراقی سرجن مجھے یہ کہانی سنا رہا تھا اس وقت مجھے خیال آیا کہ دنیا کے بہت سے خوبصورت اور منفرد کام عورت کی محبت سے وجود میں آئے۔ اگر مرد کے دل میں عورت کی سچی محبت نہ ہوتی تو نہ ''تاج محل'' اور نہ یہ ''معلق باغات'' وجود میں آتے۔

اب بابل کے کھنڈرات میں معلق باغات تو نہیں لیکن میں نے ان کھنڈرات میں کھجور اور پام کے بے شمار درخت دیکھے۔

ہم نے بابل کو دیکھا اور پرانے زمانے کی تاریخ کو عملی اور بصری لحاظ سے دہرایا اور اپنے آپ کو خوش نصیبوں کی فہرست میں شامل کرتے ہوئے دوبارہ کوفہ کی طرف اسی بڑی شاہراہ پر چل پڑے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی جائے پیدائش

بابل کے کھنڈرات عراق کے مشہور شہر حلا Hilla کے قریب ہیں۔ بابل سے نجف جانے والی سڑک کے دائیں طرف ار (Ur) شہر کے کھنڈرات نظر آئے۔ اس شہر میں آج سے چار ہزار سال پہلے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی پیدائش ہوئی تھی اور یہیں انہیں آگ میں پھینکا گیا تھا۔

چار ہزار سال پہلے یہاں نمرود کی حکومت تھی۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نمرود کے ایک افسر آزر کے گھر پیدا ہوئے۔ آزر شاہی بت تراش تھا۔ جو نمرود کے مصنوعی خداؤں کے بت بنایا کرتا تھا۔ حضرت ابراہیم خلیل اللہ پیدا ہوئے اور باپ کے برعکس بت شکن

anjumhasnain2008@yahoo.com

بنے۔علامہ اقبال نے اسی مناسبت سے فرمایا تھا کہ:

بت شکن اٹھ گئے باقی جو رہے بت گر ہیں
تھا براہیم پدر اور پسر آزر ہیں

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی بت شکنی کی بات نمرود تک پہنچی تو اسے اپنی حکومت اور خدائی کے دعوے ڈگمگاتے نظر آئے۔چنانچہ نمرود نے آزر کے ذریعے پہلے حضرت ابرہیم علیہ السلام کو بت شکنی سے باز رکھنے کی کوشش کی۔جب بات نہ بنی تو حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اپنی مجلس کے مشورہ پر آگ میں پھینک دینے کا حکم دیا۔جب اس حکم پر عمل درآمد ہوا تو اللہ تعالیٰ نے آگ کو حکم جاری کیا کہ:

ینار کونی بردا و سلما علی ابراہیم

اے آگ سرد ہو جا اور سلامت رہ ابراہیم کے لئے (سورہ الانبیاء:۶۹)

اللہ کے حکم سے آگ نے اپنی خاصیت بدلی اور گلزار میں تبدیل ہوگئی۔اس واقعہ کو علامہ اقبال نے یوں بیان کیا:

آج بھی ہو جو براہیمؑ کا ایماں پیدا
آگ کر سکتی ہے اندازِ گلستاں پیدا

ہم نے ارشہر کے کھنڈرات کو دور سے دیکھا اور نمرود کی خود ساختہ خدائی اور ظلم و جبر سے عبرت حاصل کی۔

نبی اللہ حضرت ایوب علیہ السلام

اُرشہر سے گذرنے کے کچھ دیر بعد سعد نے اعلان کیا کہ نبی اللہ حضرت ایوب علیہ السلام کا مزار آ گیا ہے۔حضرت ایوب علیہ السلام کا صبر مشہور ہے۔اس صابر پیغمبر کا مزار نجف جانے والی شاہراہ کے بالکل ساتھ ہے۔ارد گرد کھیت ہیں۔لوگ کھیتوں میں کام کر رہے تھے اور کھیتوں کے بیچ میں حضرت ایوب علیہ السلام کا مزار تھا۔یہ مزار ایک چھوٹے سے کمرے پر مشتمل تھا۔اوپر سبز گنبد تھا۔

حضرت ایوب علیہ السلام کے مزار سے کوفہ کی طرف دھان کی فصلیں تھیں۔عراق کا

مشہور چاول ''عنبر'' ان ہی کھیتوں میں پیدا ہوتا ہے۔ کھیتوں کے بیچوں بیچ ایک خوبصورت شاہراہ پر سفر کرتے ہوئے ہم دریائے فرات پر پہنچے۔

کوفہ

دریائے فرات کے اس پار کوفہ کا شہر ہے۔ جوں ہی ہم شہر میں داخل ہوئے اپنے بائیں طرف کوفہ کی قلعہ نما جامع مسجد دیکھی۔ یہ وہی مسجد ہے جہاں حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے 36 ہجری میں جنگ جمل کے خاتمہ پر دارالخلافہ مدینہ منورہ سے منتقل کیا تھا۔ حضرت علیؑ کے دور حکومت میں اسلامی دنیا کا دارالخلافہ کوفہ تھا۔

مسجد کے ساتھ حضرت علیؑ کا مکان ہے جسے دارالامراء کہتے ہیں۔ دارالامراء ایک مربع کی شکل میں 170 میٹر لمبا اور 170 میٹر چوڑا ہے۔ دیوار کی چوڑائی دو میٹر ہے۔ جامع مسجد میں حضرت مسلم بن عقیل کا مزار ہے۔ کوفہ میں زیارتیں کرنے والوں کا بڑا ہجوم تھا۔

مجھے کوفہ شہر کی بجائے ایک معمولی آبادی کا قصبہ نظر آیا۔ کوفہ دیکھ کر حیرانی ہوئی۔ چونکہ اس کا جو نقشہ میرے ذہن میں تھا۔ اس کے مطابق اسے ایک عظیم الشان شہر ہونا چاہئے تھا۔ جس کی آبادی لاکھوں افراد پر مشتمل ہوتی۔

سنا تھا حضرت حسینؑ کو کوفہ آنے کی دعوت دینے کے لئے کوئی چالیس ہزار کے قریب خطوط لکھے گئے تھے۔ چودہ سو سال پہلے چالیس ہزار خط لکھے جانے والے اہالیان شہر کا تصور تو آج لاکھوں میں ہی آتا ہے۔ مجھے کوفہ کی کل آبادی اتنی بھی نظر نہ آئی جتنے حضرت حسینؑ کو خط ملے تھے۔ زیادہ سے زیادہ چالیس ہزار۔ یہ شہر مجھے کچھ بجھا بجھا سا نظر آیا۔ کوفہ سے سفر کرتے ہوئے ہم دو بجے نجف پہنچے۔

نجف اشرف

کوفہ سے نکلے تو جلد ہی نجف معلی پہنچ گئے۔ ہماری گاڑی ایک کھلے میدان سے ہوتی ہوئی ایک جگہ آ کر رک گئی۔ باہر نکلے تو سامنے جگ مگ کرتا حضرت علیؑ کا روضہ نظر آیا۔ علماء کہا کرتے تھے کہ حضرت علیؑ کا روضہ نجف میں ایک پہاڑی پر واقع ہے۔ یہاں مجھے دور دور تک کوئی پہاڑی نظر نہ آئی۔

میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو حد نظر تک میدان پھیلا ہوا تھا۔ ایک میلہ کا سماں نظر آیا۔ مزار کے طول طویل احاطہ میں زائرین بستر لگائے اکیلے ٹولیوں میں اور کنبوں کے ساتھ خیمہ زن تھے۔ معلوم ہوتا تھا کہ یہاں رہائشی مکان تھے جنہیں گرا کر مزار کا حصہ بنا دیا گیا ہے۔

حضرت علیؑ کی تصویروں کی فروخت

مزار کے احاطے میں پاکستان کے مزاروں کی طرح دکانیں، کھوکے اور فرشی سٹال نظر آئے۔ ان سٹالوں پر حضرت علیؑ، حضرت امام حسینؑ، حضرت حسنؑ کے فوٹو فروخت ہوتے دیکھے۔ فوٹو دیکھے تو مجھے سخت حیرت ہوئی۔ ایسی حرکت اگر کوئی یورپی ملک کرتا تو مسلمان اس کا جینا حرام کر دیتے۔ میں ان ہی سوچوں میں گم مزار کے اندر داخل ہوا۔

حضرت علیؑ کے مزار کی انتظامیہ نے ہمیں خوش آمدید کہا اور ایک کشادہ کمرے میں جو اعلیٰ قسم کے فرنیچر اور ایرانی قالین سے مزین تھا، لے گئے۔ یہاں ہماری ملاقات روضے کے متولی ڈاکٹر سید حیدر کرار سے ہوئی۔ ڈاکٹر صاحب جن کی عمر پچاس سال کے قریب ہو گی خشخشی داڑھی میں بڑے سمارٹ نظر آتے تھے۔

ڈاکٹر سید حیدر کرار کا خطاب

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

میں آپ سب کو حضرت علیؑ کے روضے پر خوش آمدید کہتا ہوں۔ حضرت علیؑ کے روضے کی پانچ مرتبہ توسیع کی گئی۔ سب سے پہلے 175 ہجری میں خلیفہ ہارون رشید نے روضہ تعمیر کروایا۔ پھر وقتاً فوقتاً مزید توسیع ہوتی رہی۔ آخری بار عراق کے صدر صدام حسین نے اپنی ذاتی جیب سے روضے کی تعمیر کروائی۔ پرانا روضہ بوسیدہ ہو چکا تھا اور روضے کی تعمیر نو کی ضرورت تھی۔ صدر صدام نے روضے کی توسیع کے موقع پر کہا تھا:

"ملک کا قومی خزانہ عراق کی تمام زیارتوں کے لئے وقف ہے۔ میرا

تعلق حضرت علیؓ اور حضرت فاطمہؓ سے ہے۔اس لئے میں حضرت علیؓ اور شہدائے کربلا کے روضوں کی توسیع میں ذاتی دلچسپی لے رہا ہوں۔''

ڈاکٹر کرار نے کہا کہ ہمارا خاندان تین نسلوں سے حضرت علیؓ کا خادم ہے۔ میں اللہ تعالٰی سے دعا گو ہوں کہ اللہ تعالٰی مسلمانان عالم کو متحد ہونے کی توفیق دے۔ میں آپ سب کو اس روضے پر اور اس شہر میں خوش آمدید کہتا ہوں۔

خوش آمدیدی کلمات کے بعد ہمیں چائے پلائی گئی۔ ہم سب نے نماز ظہر اسی دفتر میں ادا کی۔ اور اہالیان بریڈفورڈ کی طرف سے نقد عطیات انتظامیہ کے حوالے کیے۔ رسید لی اور خادمین کے ساتھ روضے کے اندر چلے گئے۔

حضرت علیؓ کا روضہ

روضہ ایک وسیع عمارت کے اندر ہے جس کی اندرونی اور بیرونی دیواروں پر خوبصورت نقش ونگار ہیں۔ شیشہ اس طرح نصب ہے کہ گمان ہوتا ہے جیسے یہ شیشے کی دیواریں ہوں۔ روضے کے اندر فانوس جگ مگ کر رہے تھے۔ زائرین کی اکثریت کا تعلق ایران سے تھا۔خواتین نے کالے برقعے پہنے ہوئے تھے۔ جب ہم زیارت کر رہے تھے تو میں نے دیکھا کہ بہت سے لوگ جنازے اٹھائے ہوئے روضے کے چکر لگا رہے تھے۔ یہ بات مجھے سمجھ نہ آئی۔ ممکن ہے عقیدت کی وجہ سے لوگ جنازے دفن کرنے سے قبل روضے پر لاتے ہوں۔

اُس وقت روضے پر بہت رش تھا اتنا رش کہ بیان سے باہر۔ قدم اٹھانا مشکل تھا اگر روضے کے خادمین ہماری حفاظت کے لئے نہ ہوتے تو روضہ مبارک پر ہماری حاضری ناممکن ہو جاتی۔

روضے کے اردگرد سنہری جالیاں ہیں۔ لوگ جالیوں کے اندر پیسے پھینکتے ہیں۔ روضہ زمین سے تقریباً آٹھ فٹ اونچا تھا۔ ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے اتنے پیسے جمع ہو چکے تھے کہ روضہ قریب قریب بھر گیا تھا۔

زیارت کے بعد ہمیں بڑے دروازے کے بائیں طرف ایک چھوٹے سے کمرے میں لے جایا گیا جہاں خاک اور روضے کی چادر کے ٹکڑے تبرک کے طور پر دیئے گئے۔

جب ہم روضے سے باہر نکلے تو مجھے علامہ اقبال کا شعر یاد آیا:

خیرہ نہ کر سکا مجھے جلوۂ دانش فرنگ

سرمہ ہے میری آنکھ کا خاک مدینہ و نجف

حضرت علی رضی اللہ عنہ کے روضے کی زیارت کے بعد میرے ذہن میں سوال پیدا ہوا کہ حضرت علیؓ کی شہادت تو کوفہ میں ہوئی تھی۔ آپ کا روضہ نجف میں کیسے بنا یہ بات میں نے اپنے گائیڈ سعد سے پوچھی تو اس نے بتایا کہ:

''حضرت علیؓ نے شہادت سے قبل وصیت فرمائی تھی کہ میری میت کو ایک اونٹ پر رکھ کر اسے کھلا چھوڑ دیا جائے۔ اونٹ جہاں بیٹھے مجھے وہاں دفن کیا جائے۔ چنانچہ حضرت علیؓ کی شہادت کے بعد میت کو اونٹ پر رکھا گیا۔ اونٹ کوفہ سے چلتا چلتا ''وادی الاخیری یا وادی السلام'' میں آ کر بیٹھ گیا۔ حضرت علیؓ کو اسی مقام پر سپردِ خاک کیا گیا۔''

سعد نے بتایا کہ:

''ہم اب بھی بعض اوقات نجف کو وادی السلام کہتے ہیں۔''

حضرت علیؓ کے روضے کے بارے میں راویوں کا اختلاف ہے۔ شاہ معین الدین احمد ندوی نے ''تاریخ اسلام'' جو مکتبہ رحمانیہ اردو بازار لاہور نے شائع کی کے صفحہ نمبر 315 پر لکھا ہے کہ:

''زخمی ہونے کے تیسرے دن 20 رمضان شب یک شنبہ 40 ہجری کو انتقال فرمایا۔ حضرت حسنؓ و حسینؓ نے غسل دیا۔ حسنؓ نے نماز جنازہ پڑھائی اور رشد و ہدایت کے اس آفتابِ عالمتاب کو کوفہ کے ''عزی'' نامی قبرستان میں سپردِ خاک کیا گیا۔''

اختر زیدی کی کتاب ''حضرت علیؓ بن ابی طالب'' جو ویلکم بک ڈپو کراچی نے شائع کی کے صفحہ 274 پر درج ہے کہ:

''امیر المومنین حضرت علیؓ کی قبر کے بارے میں شدید اختلاف ہے۔ کچھ

لوگ کہتے ہیں کہ ان کی قبر کوفہ کے ایک مقام "رحبہ" میں ہے۔ قبر کو عام نظروں سے پوشیدہ رکھا گیا تا کہ خارجی لاش کی بے حرمتی نہ کریں۔

"امیر المومنین حضرت علیؑ کا موجودہ مزار نجف اشرف میں زیارت گاہ خاص و عام ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ مقبرہ بھی چوتھی صدی ہجری میں حضرت علیؑ کی وفات کے تقریباً تین سو برس بعد ایک عظیم الشان روضے کی شکل میں کوفہ کے پرانے کھنڈروں کے قریب نمودار ہوا۔ اب اسی کو مدفن علیؑ مان لیا گیا ہے۔ اور ایک ہزار سال سے زائرین دور دور سے سفر کر کے انتہائی احترام اور خلوص کے ساتھ وہاں جمع ہوتے ہیں۔ اور عقیدت کے پھول نچھاور کرتے ہیں۔"

خطیب بغدادی نے لکھا ہے کہ نجف اشرف میں حضرت علیؑ کی نہیں بلکہ مغیرہ ابن شعبہ کی قبر ہے۔ لیکن یہ بیان اس لئے قابل اعتبار نہیں کہ کسی مستند تاریخ میں اس قسم کا کوئی تذکرہ نہیں ملتا۔

تاریخ ابن خلدون حصہ اول جسے نفیس اکیڈمی کراچی نے شائع کیا کے صفحہ 551 پر لکھا ہے:

"حضرت علیؑ کی میت کو حسنؑ، حسینؑ اور عبداللہ بن جعفرؓ نے نہلایا، تین کپڑوں میں کفنایا اور آپ کے خلف اکبر امام حسنؑ نے نماز پڑھائی۔ مسجد کے قریب دفن کئے گئے۔ بعض کا بیان ہے کہ قصر میں دفن کئے گئے۔"

"نہج البلاغہ" حصہ اول خطبات حضرت امیر المومنین ترجمہ از علامہ مرزا یوسف صاحب قبلہ لکھنوی۔ اس کتاب کو شیعہ جنرل بک ایجنسی انصاف پریس ریلوے روڈ لاہور نے شائع کیا ہے۔ کتاب کے صفحہ 155 پر حضرت علیؑ کی قبر دریافت کرنے کا واقعہ یوں درج ہے:

"ہارون رشید ایک روز پشت کوفہ پر شکار کی غرض سے نکلا تو اس کو کچھ نخچر اور آہو (ہرن) نظر آئے اس نے ان کے پیچھے اپنے شکاری کتے

ڈال دیے اور خود بھی ان کا پیچھا کرنا شروع کیا کہ شاید ان لوگوں کے درمیان کوئی چیز ہے جس کو دیکھ کر یہ کتے رک گئے ہیں۔ پھر جب کتے اس مقام سے ہٹا لئے گئے تو ہرن باہر نکلے کتے پھر دوڑے اور ہرن نے پھر وہیں پناہ لی اور کتے اس جگہ کے اندر نہ گئے ہارون کو یہ دیکھ کر تعجب ہوا اور اس نے وہاں کے پیر و مرد و زن کو بلا کر یہ واقعہ بیان کیا اور وجہ دریافت کی۔ ان میں سے ایک بڈھے نے کہا کہ اگر جان کی امان پاؤں تو راز کو عرض کروں ہارون نے کہا تو مامون ہے بیان کر!

اس نے کہا کہ ان ٹیلوں کے وسط میں آپ کے ابن عم حضرت علی مرتضی سلام اللہ علیہ کی قبر مبارکہ ہے۔ کہ جس کی زیارت سے تمام انبیاء و اولیاء مشرف ہوتے ہیں۔ رشید کو اس بات کا یقین آ گیا اور اس نے پیر مرد کو انعام و اکرام کے ساتھ رخصت کیا اور پھر اس نے قبر مبارک پر ایک روضہ تعمیر کیا۔ ایک انتہائی خوشنما تصویر جو قلعی زدہ بلوری پلیٹ پر بنائی گئی ہے اب تک حضرت علیؑ کے خزانہ میں موجود تھی جس میں آہو اور ہارون کے شکار کا منظر دکھایا گیا ہے۔"

حضرت علیؑ کے روضے کی تعمیر اول کے بارے میں سید ابن طاؤس علیہ الرحمتہ نے "فرحتہ الغری" میں یوں تحریر کیا ہے:

"133ء میں جب داؤد عباسی نے 'جو کوفہ کا حاکم تھا' لوگوں کا ہجوم قبر مبارک پر دیکھا تو اس نے اپنے اصحاب کو حکم دیا کہ معمار لائے جائیں پھر ان معماروں کو اپنے ایک حبشی غلام کے ہمراہ (جس کا نام "جمل" تھا) نجف روانہ کیا۔ اور حکم دیا کہ وہاں جو قبر ہے اس کو کھودو۔ اس کی تہ میں جو کچھ برآمد ہو اس کو میرے پاس لے آؤ کیونکہ یہ لوگ غلط فہمی میں مبتلا ہیں کہ یہ قبر علیؑ ابن طالب علیہ السلام کی ہے۔ چنانچہ عمال کھدائی میں مصروف ہوئے یہاں تک کہ جب پانچ ہاتھ کی گہرائی تک پہنچے تو انہوں نے کہا کہ اب ہم ایک ایسی چٹان تک پہنچے کہ جس کو

کھودنے پر ہم قادر نہیں۔ اس کام پر طاقتور حبشی کو اتارا گیا جس نے کدال ہاتھ میں لے کر پوری قوت سے چٹان پر ماری۔ پھر دوسری اور تیسری ضرب لگائی اور پھر غلام نے زوردار چیخ ماری۔ اور گر گیا ہم نے اس سے پوچھا کہ آپ پر کیا گزری لیکن اس نے جواب نہیں دیا۔ ہم اُسے خچر پر ڈال کر کوفہ کی طرف چل پڑے کہ غلام کا گوشت اس کے بازو سے گرنے لگا یہاں تک کہ ہم داؤد کے پاس پہنچے۔ اس نے پوچھا کیا ہوا؟ ہم نے غلام کی طرف اشارہ کیا خود دیکھ لو۔ سارا واقعہ سن کر اس نے قبلہ کی طرف منہ کر کے توبہ استغفار کی اور ایک رات داؤد علی بن مصعب بن جابر کے پاس آیا اور اس سے کہا کہ قبر مبارک پر ایک صندوق بنا دے۔ لیکن اصل قصہ اس سے مخفی رکھا چنانچہ قبر پر اس کے حسب حکم صندوق بنایا گیا۔ اور اس وقت تک غلام مر چکا تھا۔"

ڈاکٹر طٰہٰ حسین اپنی کتاب "حضرت علیؓ، تاریخ اور سیاست کی روشنی میں" کے صفحہ نمبر 188 پر لکھتے ہیں:

"حضرت علیؓ کی قبر کے بارے میں راویوں کا اختلاف ہے۔ کہا جاتا ہے کہ ان کی قبر کوفہ کے ایک مقام "رحبہ" میں ہے اور اس کو چھپا دیا گیا ہے تاکہ خارجی اس کی بے حرمتی نہ کریں۔ ایک جماعت کا خیال ہے کہ حضرت حسینؓ آپ کی لاش مدینہ لے گئے اور فاطمہؓ کے بازو میں دفن کیا۔

مخالفین شیعہ میں سے غلو کرنے والوں کا بیان ہے کہ آپ کی لاش ایک تابوت میں رکھ کر اونٹ پر حجاز لے جا رہے تھے لیکن راہ میں اونٹ گم ہو گیا چند دیہاتیوں کو وہ اونٹ ملا تو انہوں نے سمجھا کہ تابوت میں کچھ مال و دولت ہے پھر جب انہوں نے دیکھا کہ اس میں ایک مقتول کی لاش ہے تو اس کو جنگل میں ایک نامعلوم جگہ دفن کر دیا۔ ان مختلف روایات پر گفتگو کبھی ختم نہیں ہو سکتی اور پھر اس میں کوئی فائدہ بھی نہیں۔"

نجف اشرف میں حضرت علیؓ کے جگمگ کرتے روضے پر حاضری اپنے دل میں جو خوشی اور سکون پیدا ہو تھا وہ راویوں کی مختلف آرا کے بعد کچھ پھیکا پڑ گیا۔ میں اسلام کی اُس عظیم ہستی کے بارے میں سوچتا رہا جس نے بچپن میں اسلام قبول کیا۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی تربیت میں جوان ہوئی اور جو ہر وقت حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر اپنی جان اور مال قربان کرنے کے لئے تیار رہتی تھی۔

اسلام کے اولین دور میں جب کفار مکہ نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی اجیرن کر دی اور آپ ہجرت فرمانے پر مجبور ہوئے تو کفار مکہ نے رات کے اندھیرے میں شمع رسالت کو گل کرنے کا ناپاک و نامراد منصوبہ بنایا۔ حضرت علیؓ کو اس کا علم ہوا تو انہوں نے کمال ہمت اور جرأت سے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو پیش کش کی کہ: "رات کو میں آپ کے بستر پر چادر لپیٹ کر سو جاتا ہوں تاکہ دشمن یہ سمجھے کہ آپ آرام فرما رہے ہیں۔" حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علیؓ کو اپنے بستر پر لٹا کر خود ہجرت فرمائی۔ حضرت علیؓ کو اس بات کا پتہ تھا کہ کفار رات کو حملہ کریں گے لیکن عشق رسول صلی اللہ علیہ وسلم میں انہوں نے شمع رسالت کو بچانے کے لئے اپنی زندگی کی ذرہ بھر پروا نہ کی۔

حضرت علیؓ کا عشق رسول میں ڈوبا ہوا یہ کارنامہ اتنا بڑا اور نمایاں ہے کہ اے دشمن علیؓ اور دشمنان اسلام نے بھی ہمیشہ سراہا۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی جگر گوشہ حضرت فاطمہؓ کو آپ کے عقد میں دیا۔ اور حضرت علیؓ نے بچپن سے شہادت تک اپنی تلوار کو جہاد اللہ میں استعمال کیا۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا کہ:

انا دار الحکمۃ وعلی بابھا

(میں حکمت کا شہر ہوں اور علی اس شہر کا دروازہ)

ہماری بدقسمتی ہے کہ حضرت علیؓ کی اس جہاں سے رخصتی کے ساتھ ہی حکمت و دانش کا باب ہماری نظروں سے اس طرح اوجھل ہوا کہ ہم آج تک اس دروازہ کی تلاش میں بھٹکتے پھرتے ہیں۔

نجف اشرف کے علاوہ افغانستان کے صوبے بلخ میں مزار شریف کے مقام پر

سلجوق حکمرانوں نے 1136ء میں حضرت علیؑ کا ایک عالی شان روضہ تعمیر کروایا تھا جو اب بھی موجود ہے۔ ہر سال ہزاروں کی تعداد میں عقیدت مند وہاں زیارت کے لئے جاتے ہیں۔ اسی روضہ کی مناسبت سے یہ شہر مزار شریف کہلاتا ہے۔

یوں برگزیدہ صحابی اور چوتھے راشد خلیفہ کے بارے میں اتنے اختلافات ہیں، جنہیں مفکرین اور محققین آج تک حل نہ کر سکے۔

میں سوچتا رہا، کڑھتا رہا اور روتا رہا۔

میں جو اس شہر میں محض ایک سیاح، ایک زائر کی حیثیت میں آیا تھا، اس کے سوا اور کیا کر سکتا ہوں کہ:

جو دیکھا اُسے لکھ دیا اور جو سنا وہ سنا دیا۔

حقیقت کیا ہے؟ وہ اللہ تعالیٰ بہتر جانتے ہیں۔

نجفِ اشرف سے کربلائے معلیٰ

ہم چار بجے نجف اشرف سے کربلائے معلیٰ کے لئے روانہ ہوئے۔ نجف سے کربلا 78 کلومیٹر، حلا سے 45 کلومیٹر اور بغداد سے 102 کلومیٹر دور ہے۔ نجف میں حضرت علیؑ کے روضے کے ساتھ بہت بڑا میدان ہے جس کے بائیں طرف بسوں کا اڈہ ہے۔ میدان کے آخر پر سڑک ہے۔ اس کے آگے کا علاقہ جادوال کہلاتا ہے، جہاں پانی زمین میں رس رس کر اس طرح جمع ہو چکا ہے کہ دور سے سیاحوں کو ایک بڑی جھیل معلوم ہوتی ہے۔ ہماری گاڑی مزار سے چلی' وسیع احاطے سے گزری' پانی کے کنارے سڑک سے بائیں مڑی اور پھر تقریباً پانچ سو گز کے بعد دائیں مڑ گئی۔

شہر خموشاں

اب ہم جس سڑک پر تھے وہ وادی عزیٰ کہلاتی ہے۔ اس کے دائیں طرف دکانیں تھیں۔ دکانوں کے پیچھے حضرت علیؑ کا مزار اور اس سے ملحق میدان تھا اور بائیں طرف ایک بہت بڑا قبرستان۔ ہماری گاڑی اس سڑک پر چلتی رہی پھر آخر بائیں مڑ کر ایک ایسے شہر میں داخل ہوئے جسے ہم شہر خموشاں کہتے ہیں۔ میں شہر خموشاں کے بارے میں

پڑھتا اور سنتا رہا تھا۔ لیکن حقیقی معنوں میں شہرِ خموشاں اُس دن دیکھا! حد نظر تک قبریں اور مقبرے تھے۔ بعض قبریں دو منزلہ بلکہ سہ منزلہ تھیں۔ کچھ قبروں پر نصب تختیوں پر مرنے والوں کے نام، پتے اور تصویریں بھی موجود تھیں۔ میں نے زندگی میں اتنا بڑا قبرستان کبھی نہیں دیکھا تھا۔

میں نے سعد سے پوچھا کہ کیا یہ دنیا کا سب سے بڑا قبرستان ہے؟

سعد بولا: ''نہیں!

یہ دوسرے نمبر پر ہے۔ پہلے نمبر پر روس میں ہے۔''

قبرستان تقریباً دس میل کے علاقہ میں پھیلا ہوا تھا۔ اس میں سڑکیں تھیں، قبریں تھیں۔ بعض مقبروں پر گمان ہوتا تھا کہ یہ کسی کا رہائشی مکان ہے۔ وہ مقبرے مکانوں سے بھی اچھے تھے۔ ہم نے دنیا کے اس دوسرے بڑے قبرستان کو عبور کیا اور اس سڑک پر آ پہنچے جو کربلائے معلیٰ جاتی ہے۔

کربلا جانے والی سڑک خوبصورت تھی اور علاقہ میدانی تھا۔ جگہ جگہ فصلوں سے بھرے سرسبز کھیت نظر آئے۔ کربلا کے علاقہ میں سب سے اچھے سنگترے پیدا ہوتے ہیں۔ ہم ان سرسبز کھیتوں، باغات اور چشموں سے گزرتے ہوئے مغرب کے وقت 5.40 منٹ پر کربلائے معلیٰ پہنچے۔

کربلائے معلیٰ

کربلا میدان نہیں بلکہ شہر ہے۔ ہم گاڑی سے اُترے اور حضرت امام حسینؑ کے روضے کی طرف چل پڑے۔ ایک کھلے احاطے میں ایک طرف حضرت امام حسینؑ اور دوسری طرف حضرت عباسؑ علم بردار کا مزار ہے۔ ہر دو مزاروں کے درمیان کھلی جگہ ہے جس پر ایک پارک کا گمان ہوتا ہے۔ خوبصورت ترتیب سے فوارے اور پھول کھلے ہیں۔ فواروں کا منظر شالا مار باغ لاہور کی یاد دلاتا ہے۔ پورا علاقہ روشنیوں کے ساتھ سجایا گیا تھا۔

علاقہ جگمگ کرتا تھا۔

اس جگمگ کرتے علاقے میں لوگوں کا بے پناہ ہجوم تھا۔ خواتین نے لمبے لمبے

کالے برقعہ نما لباس پہنے ہوئے تھے۔ جوان لڑکیاں جین اور قمیض میں بھی تھیں۔ بچوں نے بڑوں کے ہاتھ پکڑے ہوئے تھے۔

حضرت امام حسینؓ کے روضے پر پہنچے تو نماز مغرب کا وقت ہو چکا تھا۔ ہم نے مزار کے گرد میں نماز ادا کی۔ نماز پڑھنے کے بعد میں دیوار کے ساتھ ٹیک لگا کر بیٹھ گیا اور سوچنے لگا۔ یہ وہی مقام ہے جس کے بارے میں مولانا ظفر علی خان نے کہا تھا کہ:

اے کربلا کی خاک تو اس احسان کو نہ بھول
تڑپی ہے تجھ پہ لاش جگر گوشۂ بتولؓ
مظلوم کے لہو سے تری پیاس بجھ گئی
سیراب کر گیا تجھے خونِ رگِ رسولؐ

اسی خاک کربلا پر آج سے ساڑھے تیرہ سو سال پہلے قافلہ آل رسولؐ اُترا تھا مقابلے میں ساز و سامان سے لیس یزیدی فوج تھی۔ ان کے پاس گھوڑے اور اونٹ تھے، نیزے اور تیر تھے۔ یزیدی فوج نے حضرت علیؓ اور خاتونِ جنت حضرت فاطمہؓ کے جگر گوشوں کو گھیرے میں لے رکھا تھا۔ ان کا اصرار تھا کہ "یزید کی حکومت کو تسلیم کرو اور اگر بیعت سے انکار ہے تو ہم سے جنگ کرو۔"

حضرت امام حسینؓ نے یزید کی غیر شرعی حکومت' جو خلافت کو ملوکیت کی طرف لے جانے والی تھی' کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ یہ مسئلہ دس دنوں تک الجھا رہا آخر دس محرم کو وہ واقعہ پیش آیا جس نے تاریخ اسلام کو بدل کر رکھ دیا۔

اسی میدانِ کربلا میں حق و صداقت کی جنگ کا آغاز ہوا۔ پہلے ایک کے مقابلے میں ایک اور پھر اجتماعی جنگ میں ایک ایک کر کے اہلِ بیت کے فرزند شہید ہوئے۔

حضرت علی اکبرؓ، عبداللہ بن مسلمؓ، جعفر بن طیارؓ کے پوتے عدی، عقیل کے فرزند عبدالرحمان، حضرت قاسم اور ابو بکر میدانِ جنگ میں شہید ہوئے۔ اسی کربلا میں اہل بیت کی بیبیوں اور بیٹیوں نے اپنے جگر کے ٹکڑوں کو اسلام کے لئے قربان ہوتے دیکھا۔

جنگ اس وقت ختم ہوئی جب امام عالی مقام حضرت امام حسینؓ میدان میں اُترے۔ انہوں نے پامردی سے بھوکے پیاسے لڑائی کی۔ ذرعہ بن شریک تمیمی نے ہاتھ اور

گردن پر وار کیا۔ سنان بن انس نے تیر چلایا جس پر آپؑ زخمی ہو کر گر پڑے۔ آپؑ کے گرنے کے بعد سنان بن انس نے سر اقدس تن سے جدا کر دیا اور یوں:

سر داد نہ داد دست در دستِ یزید
حقا کہ بنائے لاالہٰ است حسینؑ

روایت ہے کہ حضرت امام حسینؑ کے جسم پر 33 زخم نیزے کے اور 43 زخم تلوار کے پڑے تھے۔ شہید کرنے کے بعد عمر بن سعد کے حکم سے دس سواروں نے آپ کی نعش کو گھوڑوں کے سموں سے پامال کیا۔

اس معرکہ میں 72 آدمی شہید ہوئے۔ جن میں بیس خاندان بنی ہاشم کے چشم و چراغ تھے۔ شہادت کے بعد اہل بیت کی بیبیوں، بچوں اور امام حسینؑ کے سر کو کوفہ اور پھر شام میں یزید کے پاس بھیج دیا گیا۔

روایت ہے کہ جب حضرت امام حسینؑ کا سر مبارک یزید کو پیش کیا گیا تو وہ روتے ہوئے اپنے فوجیوں کو کہنے لگا کہ میں نے حسینؑ کو قتل کرنے کا حکم نہیں دیا تھا بلکہ اس سے بیعت لینے کا حکم دیا تھا یہ ابن زیاد نے غلط کیا۔

میرے خیال میں یہ بات غلط بیان کی جاتی ہے۔ چونکہ:

- امام حسینؑ کو اگر یزید کے حکم کے بغیر شہید کیا گیا تھا تو یزید نے قاتلوں کے خلاف کیا کاروائی کی؟
- کیا انہیں سزائیں دیں؟
- انہیں عہدوں سے معزول کیا؟

نہیں بالکل نہیں!

میں سمجھتا ہوں کہ یہ قصے کہانیاں کسی نے بعد میں تراشی ہیں۔

شہادت کے دوسرے دن بنو اسد غاضریہ سے آئے اور انہوں نے اسی میدان میں شہدا کو دفن کیا۔ حضرت امام حسینؑ بھی دفن ہوئے لیکن صرف اُن کا دھڑ دفن کیا گیا۔ سر مبارک کو قطع کر کے یزیدی فوج اپنے ساتھ لے گئی تھی۔ کربلا کے شہیدوں کی یاد میں میرا دل بھر آیا۔ احترام اور عقیدت سے میرا سر جھک گیا!

ہمارے قافلے نے حضرت امام حسینؑ کے روضے کے متولی السید علاء السید ناصر آل نصراللہ سے ان کے دفتر میں ملاقات کی۔ چالیس سالہ کلین شیو صحت مند سید علاء نے لمبا چوغہ نما لباس پہنا ہوا تھا' سر پر اونچی کالے رنگ کی ٹوپی تھی جس پر سبز رنگ کا پٹکا بندھا ہوا تھا۔ دفتر میں صدر صدام حسین کا فوٹو بڑی نمایاں جگہ آویزاں تھا بالکل اسی طرح جس طرح حضرت علیؑ کے متولی کے دفتر میں آویزاں تھا۔

السید علاء السید ناصر آل نصراللہ کا خطاب

''ہم آپ کو حضرت امام حسینؑ اور حضرت عباسؑ کے شہر میں خوش آمدید کہتے ہیں۔ عراق کا صدر صدام حسین دنیا کے تمام مسلمانوں کے تحفظ کی خاطر امریکہ کے خلاف مسلمانوں کی جنگ لڑ رہا ہے۔ ہم بالکل خوفزدہ نہیں۔ عراق نے اسرائیل کے خلاف بھی جنگ کی تھی۔ انشاءاللہ اسلام پوری دنیا میں پھیل جائے گا۔ فرانس میں حال ہی میں ریسرچ ہوئی کہ 33 ممالک نے مل کر عراق پر حملہ کیا اور اسے شکست نہ دے سکے اس کی وجہ کیا ہے؟'' جو لوگ ریسرچ کر رہے تھے انہوں نے بتایا کہ خدا اس سرزمین کو پسند کرتا ہے اور اس کی حفاظت کرتا ہے۔ یہ اسلامی ملک ہے اسی سرزمین پر تمام پیغمبر اور انبیاء آئے۔ حضرت علیؑ کی قبر' حضرت آدم علیہ السلام اور حضرت نوح علیہ السلام کے درمیان واقع ہے۔ عراق میں دو دریا یعنی دجلہ اور فرات بہتے ہیں۔ ہمارا ملک زرعی ہے اور ہم خود کفیل ہیں۔ انشاءاللہ ہماری فتح ہوگی۔ میری خواہش ہے کہ آپ ہمارا یہ پیغام برطانیہ کے دوسرے مسلمانوں تک پہنچائیں۔ اگر مجھے موقع ملا تو انشاءاللہ آپ کے پاس برطانیہ آؤں گا۔''

خطاب کے بعد ہمیں تحفے دیئے گئے جن میں خاک کربلا اور حضرت حسینؑ کے روضے کی چادریں شامل تھیں۔

ہم نے اہالیان بریڈفورڈ کی طرف سے عطیات' جو کیش کی شکل میں تھے' دیئے۔

رسید لی اور خادمین کی نگرانی میں روضے پر حاضر ہوئے۔

روضے کے چاروں طرف صحن ہیں جن میں ہزاروں کی تعداد میں لوگ بیٹھے، کھڑے یا گھومتے پھرتے نظر آتے ہیں۔ ہم صحن سے اصل روضے میں داخل ہوئے۔ سامنے حضرت امام حسینؑ اور ساتھ علی اصغرؑ اور علی اکبرؑ کے مزار تھے۔ اندر جا کر جائزہ لیا تو مزار ایک کھلے ہال کے عین درمیان تھا لیکن خلقت اتنی تھی کہ یہ بڑا ہال بھی تنگ دامانی پر مجبور تھا۔ خادمین نے بڑی کوشش سے ہمیں روضے کی جالی تک پہنچایا۔

روضہ زمین سے تقریباً آٹھ فٹ اونچا تھا۔ جالیاں سنہری تھیں اور اندر قبر پر اتنے نوٹ تھے کہ قبر ان نوٹوں سے ڈھکی ہوئی تھی۔ ہم نے روضے کی زیارت کی۔ اس کے ساتھ ہی صحابی حبیب ابن مظاہرؓ کا مزار ہے۔ اُن کی عمر تقریباً نوے سال تھی۔ اور وہ اسی مقام پر شہید ہوئے تھے۔ ان کے ساتھ 72 شہدا کا اجتماعی مزار ہے۔ ذرا آگے مقتل ہے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں حضرت امام حسینؑ کو شہید کیا گیا تھا۔

ہم مقتل میں پہنچے تو وہاں اس وقت خواتین کی ایک بڑی تعداد زیارت کر رہی تھی۔ بعض عقیدت سے جالیوں کو چھو رہی تھیں اور کچھ غم کی شدت میں رو رہی تھیں۔ خدمتگاروں نے ان خواتین کو وہاں سے فوری نکل جانے کا حکم دیا تاکہ جگہ خالی ہو اور برطانیہ سے تشریف لانے والا وفد زیارت کر سکے۔ خواتین نے فریادی نظروں سے خدمتگاروں کو اور پھر حسرت بھری نظروں سے ہمیں دیکھا کہ خوش نصیبو! کر لو دیدار اس مقام مقدس کا۔ خواتین نے لمبی آہ بھری اور نہ چاہتے ہوئے بھی وہاں سے چلی گئیں۔

عورتوں کو وہاں سے جاتے دیکھا تو مجھے یوں محسوس ہوا جیسے ہم نے ان کی حسرتوں اور عقیدتوں کا قتل اسی مقام پر کیا جہاں حضرت امام حسینؑ قتل ہوئے تھے۔ اس خصوصی برتاؤ پر خوش ہونے کی بجائے میرا ضمیر مجھے ملامت کرنے لگا۔ مجھے دربار کے خدمتگاروں کی یہ حرکت بالکل پسند نہیں آئی۔

میدان کے دوسرے کنارے حضرت عباسؑ کا مزار ہے۔ ممکن ہے حضرت عباسؑ میدان کے اسی کنارے پر شہید ہوئے ہوں جہاں اُن کا مزار ہے۔ حضرت عباسؑ کا مزار حضرت امام حسینؑ کے مزار کی طرز کا ہے۔ وہی نقشہ وہی ڈیزائن اور وہی رش۔ ہم نے

یہاں بھی حاضری دی۔

جب میں کربلا میں تھا تو میری نظروں کے سامنے متواتر وہ منظر گھومتا رہا جب بھوکے پیاسے آل رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو اس میدان میں شہید کر کے اہل سادات کا نام ہمیشہ کیلئے ختم کرنے کی کوشش کی گئی تھی۔

یزید کو اپنی فوجی طاقت پر غرور تھا لیکن اللہ کو کچھ اور منظور تھا۔ یزیدی حربے ناکام ہوئے اور آج کربلا میں شہداء کے مزار جگمگ کرتے یزیدیوں کے منہ پر طمانچے مار رہے تھے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نواسی حضرت زینبؓ کا یزید کے دربار میں تاریخی خطاب میرے کانوں میں گونجنے لگا۔ حضرت زینبؓ نے یزید کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا تھا:

یزید!

"تیرے ظلم کی انتہا ہو چکی ہے کہ تیری ماں، بہنیں اور بیٹیاں تو پردے میں ہوں اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی نواسی' علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی بیٹی اور فاطمہؓ کی لختِ جگر تیری لونڈیوں اور تیرے غلاموں کے سامنے رسیوں میں جکڑی ہوئی بے پردہ کھڑی ہو۔ تو نے دنیا کی جس عارضی حکومت کیلئے اہل بیت کو اپنے ظلم و ستم کا نشانہ بنایا ہے وہ حکومت مٹ جائے گی اور میرے بھائی حسینؓ کا خون ناحق رنگ لائے گا اور یہ تیرا خیال غلط ہے کہ میرے بھائی حسینؓ کا نام مٹ جائے گا۔ نہیں! میرے بھائی کا نام قیامت تک زندہ رہے گا۔ اس لئے کہ اس نے قوموں کو زندہ کیا ہے۔ مسلمان نسل کو زندہ کیا ہے۔ دین حق کو زندہ کیا ہے اور مری ہوئی روح جمہوریت کو زندہ کیا ہے۔"

کربلا کے بعد کے حالات نے حضرت زینبؓ کی ایک ایک بات کو سچ ثابت کیا۔ میں متعدد اسلامی ممالک کی سیاحت کر چکا ہوں۔ میں نے کہیں بھی یزید کا نام و نشان نہیں دیکھا۔ اس کے برعکس حضرت حسینؓ اور آل رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو مسلمانوں کے دلوں پر حکومت کرتے دیکھا۔

حضرت امام حسینؓ نے اپنی اور اپنے خاندان کی جانوں کا نذرانہ پیش کر کے دین اسلام کو زندہ کیا اور اپنے عمل سے رہتی دنیا تک ایک مثال قائم کرتے ہوئے مسلمانوں کو درس دیا کہ مشکل وقت میں اسلام کی حفاظت کس طرح کی جائے۔

قتل حسینؓ اصل میں مرگ یزید ہے

اسلام زندہ ہوتا ہے ہر کربلا کے بعد

اب کربلا ایک خوبصورت اور جدید شہر ہے۔ یہاں میں نے زائرین کو زیارتیں کرتے اور دکانوں سے تحفے خریدتے دیکھا۔ ہم نے بھی تحفے خریدے۔ کربلا سے نکلنے سے قبل حاجی یونس اویسی صاحب ایک کنوئیں پر جانا چاہتے تھے اس کنوئیں کی نسبت حضرت امام حسینؓ کے ساتھ تھی۔ کنوئیں پر جانے کے لئے ہم ایک گلی میں گئے لیکن وہاں جا کر پتہ چلا کہ وقت زیادہ ہو گیا تھا اس لئے اسے عوام کے لئے بند کر دیا گیا تھا۔

دریائے فرات کی تلاش

میں نے مزاروں کی زیارتیں کیں، شہر گھوم کر دیکھا لیکن مجھے دریائے فرات نظر نہیں آیا۔ علماء سے سنا اور کتابوں میں پڑھا تھا کہ دریائے فرات میدانِ کربلا کے پاس بہتا ہے۔

میں نے سعد سے پوچھا: ''دریائے فرات کہاں ہے؟''

سعد نے کہا: ''جب فرات آئے گا تو بتا دوں گا۔''

میں نے پوچھا: ''کیا فرات کربلا کے پاس نہیں بہتا؟''

سعد نے کہا: ''نہیں! فرات کربلا سے تیس کلو میٹر دور ہے۔''

میں نے سعد سے کہا کہ میرے تصور کا کربلا کچھ یوں تھا کہ ایک کھلا میدان ہوگا جس کے ساتھ ساتھ دریائے فرات بہتا ہوگا اتنا قریب کہ وہاں پیدل جا کر آدمی پانی لے سکتا تھا لیکن یزیدی فوجوں نے پانی نہیں لینے دیا۔

سعد نے مسکراتے ہوئے کہا:

''دریا اپنے رخ بدلتے رہتے ہیں۔ چودہ سو سال میں دریا اپنا رخ بدلتے بدلتے اصل مقام سے تیس کلو میٹر دور ہو گیا۔''

مجھے سعد کی رائے سے اتفاق نہیں۔ ممکن ہے حضرت علیؑ کے روضے کی طرح محققین نے اس بارے میں بھی کوئی خاص تحقیق نہ کی ہو یا پھر ہمارے علماء سنی سنائی باتوں کے سہارے شعلہ بیانی کی روانی میں دریائے فرات کو بھی میدان کربلا کے پہلو میں کھینچ لائے ہوں۔

بچوں کی سوچ محدود ہوتی ہے۔ بچپن میں یزید کے بارے میں میرا خیال تھا کہ یہ کوئی کافر تھا جس نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے نواسوں کو شہید کیا تھا۔ جوان ہو کر پتہ چلا کہ یزید اس وقت مسلمانوں کا خلیفہ تھا۔

ہماری گاڑی رات 8:45 پر کربلا سے چلی تو میں سوچنے لگا کہ واقعۂ کربلا کے بعد اموی دورِ حکومت میں یہ جگہ بالکل ویران رہی ہوگی۔ جب اموی دور ختم ہوا تو پھر شہدائے کربلا کے روضے تلاش کیے گئے اور ان پر مقبرے بنے۔

مجھے یاد آیا میں نے اختر زیدی کی کتاب ''حضرت علیؑ بن ابی طالب'' میں پڑھا تھا کہ ''آلِ بویہ کے مشہور وزیر معزالدولہ نے 352 ہجری میں نجفِ اشرف میں حضرت علیؑ کے مزار پر ایک شاندار عمارت تعمیر کروائی تھی اور معزالدولہ ہی نے دس محرم الحرام یعنی یوم عاشورہ کو مملکت اسلام کے چپے چپے پر سرکاری حیثیت دی تھی۔ سرکاری حکم تھا کہ عاشورہ کے دن بازار بند رہیں۔ نانبائی کھانا نہ پکائیں۔ جگہ جگہ قبے نصب ہوں جن پر سیاہ پردے لٹکائے جائیں۔ خواتین بال کھولے بازاروں میں منہ پیٹتی ہوئی نکلیں اور حضرت حسینؑ کا ماتم کریں۔ محرم کی دسویں تاریخ کو علم اور تعزیوں کے جلوس ہر شہر اور بستی میں نکلتے تھے اور کسی کی مجال نہ تھی کہ سیاہ لباس کے علاوہ کوئی دوسرا لباس پہنے۔''

میں سوچوں میں گم تھا کہ گاڑی دریائے فرات کے کنارے رات نو بج کر چالیس منٹ پر جارکی۔

سعد نے کہا:

''یا السیدی شیخ یعقوب نظامی! اُترو اور جا کر دریائے فرات کو دیکھو۔''

ہم سب اُتر کر دریا کے کنارے گئے۔ حاجی کرامت حسین کی خواہش تھی کہ دریائے فرات کا پانی ساتھ لے جائیں گے۔ جب حاجی کرامت حسین صاحب پانی بھرنے لگے تو حاجی رحمان بولے:

''جس دریائے فرات کا پانی حضرت امام حسینؑ کو پینا نصیب نہیں ہوا۔ وہ ہمیں کیا فائدہ دے گا؟''

حاجی رحمان کی بات سچی تھی!

لیکن دوسری طرف بات عقیدت کی تھی۔

ایک اور صاحب بولے: ''اس پانی میں شفا ہے۔''

میں حیران تھا کہ اگر اس پانی میں شفا ہے تو عراق کے محکمہ صحت کو اس کا علم کیوں نہیں ہوا؟ اگر انہیں کوئی آدمی یہ راز کی بات بتا دے تو پھر وہ امریکہ اور یورپ سے ادویات منگوانے کا مرہون منت نہ رہے اور یوں لاکھوں بچے بغیر علاج کے نہ مریں۔

دریائے فرات سے سفر کرتے ہوئے جب ہم بغداد کے قریب پہنچے تو کسی کی بارات بینڈ باجوں کے ساتھ گاڑیوں میں جا رہی تھی۔ دلہا اور دلہن خوبصورت کاروں میں بیٹھے تھے۔ ڈھول بجتے اور ناچ گانا ہوتا دیکھا تو وطن عزیز کی شادیوں کی یاد تازہ ہوگئی۔

رات بارہ بجے ہم واپس ہوٹل میں پہنچے تو غوث الاعظمؒ کے مزار کے مؤذن شیخ عمر نے، جو آج بھی ہمارے ساتھ تھے، پیسے مانگنے شروع کر دیئے۔ گزشتہ روز سب ساتھیوں نے چندہ کر کے انہیں تقریباً چار سو ڈالر دیئے تھے جو ایک اچھی خاصی رقم تھی لیکن آج وہ خود ہی بغیر کسی کے کہنے کے ہمارے ساتھ اسی طرح نتھی ہو گئے جیسے ''جمعہ جنج نال'' چلتا ہے۔

ہم نے اسے پیسے دینے سے انکار کر دیا لیکن وہ جانے کا نام نہیں لیتا تھا۔ آخر تنگ آ کر حاجی کرامت حسین اور حاجی رشید صاحب نے چار سو ڈالر اپنی جیبوں سے دے کر اس سے جان چھڑائی۔

ہم سب نے ان ''معزز'' مانگنے والوں کے کرتوتوں سے توبہ توبہ کی۔

بغداد شہر کی سیر

بابل، کوفہ، کربلا کے سفر کے بعد مجھے آرام کی ضرورت تھی۔ چنانچہ دوسرے دن میں نے قافلے سے الگ ہو کر بغداد شہر کی سیر کا فیصلہ کیا۔ ظہور آرٹسٹ کو جب میرے ارادوں کا علم ہوا تو انہوں نے بھی میرے ساتھ چلنے کو ترجیح دی۔

جب قافلہ کے باقی لوگ سامرا کی سیاحت کے لئے گئے تو ہم دونوں بازار کی سیاحت کو چل پڑے۔

ہم المنصور ہوٹل سے باہر نکل کر ایک بڑی شاہراہ پر آ گئے۔ سڑک یکطرفہ ٹریفک کے لئے ہے۔ دونوں سڑکوں کے درمیان خوبصورت درخت اور پھول بوٹے لہراتے علاقے کے حسن کو دوبالا کر رہے تھے۔ ہم نے ٹیکسی کی بجائے پیدل چلنے کا فیصلہ کیا۔ اسی شاہراہ پر بائیں مڑ کر چلنے لگے تو تھوڑے فاصلہ پر دریائے دجلہ پر بنا ہوا ایک پل نظر آیا۔ یہ انتہائی کشادہ پل تھا اور اس پر ٹریفک کا یکطرفہ انتظام تھا۔ ایک طرف کی سڑک پر تین تین لائینیں تھیں۔ ہم دائیں مڑ کر پل پر چلنے لگے جب عین درمیان میں پہنچے تو ظہور صاحب نے کیمرہ نکالا اور فوٹو کھینچنے لگے۔ اس کتاب کے گرد پوش پر میری جو تصویر ہے وہ ظہور صاحب نے اسی مقام پر کھینچی تھی۔

ہم کافی دیر پل پر کھڑے دریا میں چلتی کشتیوں اور آبی پرندوں کی قلا بازیوں سے لطف اٹھاتے اور فوٹو گرافی کرتے رہے۔ دریا کے کنارے دور دور تک پارک بنے ہیں جن میں رنگ برنگے پھول اپنی بہار دکھاتے ہیں۔ بغداد کا شہر دریائے دجلہ کے دونوں کناروں پر آباد ہے۔ ایک طرف جدید شہر ہے اور دوسری طرف پرانا شہر۔

دریائے دجلہ کو عبور کرنے کے لئے شہر میں کئی پل ہیں۔ ان پلوں میں سے اکثر کو امریکہ اور یورپ نے 1991ء کی خلیجی جنگ میں تباہ کر دیا تھا لیکن جنگ کے بعد عراقی ماہرین نے اپنے کمال فن سے ان کو بالکل اسی طرح دوبارہ بنا دیا جس طرح یہ جنگ سے پہلے تھے۔ میں نے یہ بات ایک سفارت کار سے پوچھی تو انہوں نے رازدارانہ لہجہ میں بتایا کہ جب یہ پل تیار ہوئے تھے تو اس وقت حکومت نے ان کمپنیوں کو حکم دیا تھا کہ جب ایک پل نصب کیا جائے تو دوسرے پل کیلئے سامان سٹاک میں جمع کروایا جائے تاکہ اُسے ہنگامی طور پر استعمال میں لایا جا سکے۔

ہم اسی پل پر کھڑے دریا، شہر، ٹریفک اور لوگوں کا نظارہ کر رہے تھے۔ پل کو عبور کر کے ہم پرانے شہر میں داخل ہوئے اور ایک بہت مصروف شاہراہ کے ساتھ ساتھ فٹ پاتھ پر چلنا شروع کر دیا۔ ہماری دائیں طرف شاہراہ اور بائیں طرف دکانیں تھی۔ چلتے چلتے ہم

بائیں جانب مڑے تو ایک عالی شان عمارت کے باہر بورڈ آویزاں تھا ''وزارۃ التجارۃ'' یعنی وزارت تجارت۔ وزارت تجارت کے دفتر سے گزر کر ہم کچھ دیر چلنے کے بعد بائیں مڑ گئے۔ یہ ایک تنگ گلی تھی جس کے دونوں طرف دکانیں تھیں۔ ہم نے صبح ناشتہ نہیں کیا تھا اس لئے ہمیں کسی ایسی جگہ کی تلاش تھی جہاں سے ناشتہ مل سکے۔ آخرکار ایک کیفے ٹیریا نظر آیا۔ ہم اندر چلے گئے اور ناشتہ مانگا لیکن اُدھر سے تیز عربی میں جواب ملا جو ہمارے سر سے گزر گیا۔ جب زبان نے ساتھ نہ دیا تو بات اشاروں پر آئی لیکن وہ بھی کامیاب ثابت نہ ہو سکی۔ تھک ہار کر ہم نے چائے مانگی تو ہمیں بیٹھنے کا اشارہ کیا گیا۔ ہم ایک میز پر بیٹھ گئے۔ ہماری تواضع چائے سے کی اور اصرار کے باوجود ہم سے پیسے نہیں لیے گئے۔

چائے خانے سے نکل کر ہم نے بازاروں کی گشت شروع کر دی۔ اس پرانے شہر کی گلیاں تنگ اور خریداروں کا اس قدر ہجوم تھا کہ مجھے گوجرانوالہ کا چوڑیاں بازار یاد آ گیا جہاں سے صحیح سلامت واپس آنے کے بعد اللہ کا شکر ادا کرنا پڑتا ہے۔ بازار میں ریڑھیوں پر گڑ، شکر، کھجوریں، ازاربند اور پراندے وغیرہ فروخت ہوتے دیکھے۔ ان گلیوں میں گھومتے پھرتے دوبارہ بڑی شاہراہ پر آئے تو دونوں طرف بڑے بڑے پلازے دیکھے۔ ہم نے کھلے بازار میں گھومنا شروع کر دیا۔ غالباً اس دن بڑی بڑی دکانیں بند تھیں اور فٹ پاتھ مارکیٹ کا کام زوروں پر تھا۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میں کراچی کی زیب النساء سٹریٹ میں اس وقت گھوم رہا ہوں جب دکانداروں نے اپنی دکانیں بند کر دی ہیں اور غریبوں نے فٹ پاتھ پر اپنی چھوٹی چھوٹی اشیائے ضرورت سجا دی ہیں۔

فٹ پاتھ کے ان دکانداروں کی اکثریت انگریزی میں بات چیت کر سکتی تھی۔ معلوم ہوتا تھا جیسے یہ سب یونیورسٹیوں کے طالب علم ہیں جو فالتو وقت میں سٹال لگا کر روزی کما رہے ہیں۔ چلتے چلتے ہم آخر پر دائیں مڑے تو ایک اوپن ''جمعہ یا سنڈے'' مارکیٹ میں جا پہنچے۔ یہ ایک کھلی جگہ تھی جہاں ہر طرف ریڑھیاں ہی ریڑھیاں اور سٹال نظر آئے۔ ان سٹالوں اور ریڑھیوں پر مختلف قسم کی نئی، پرانی اور سیکنڈ ہینڈ چیزیں فروخت ہو رہی تھیں۔

ظہور صاحب نے ایک سٹال سے خطاطی کے کچھ قلمی نسخے خریدے۔ گھومتے گھومتے دوپہر ہو گئی چنانچہ ہم ایک ریستوران میں گئے اور کھانا کھایا۔

کھانا کھانے کے بعد ایک اور شاپنگ سینٹر میں گئے جہاں دکانیں کھلی تھیں۔
دکانوں کے باہر اسی طرح سامان لٹکایا ہوا تھا جس طرح برصغیر میں لٹکایا جاتا ہے۔ صبح سے اب تک میں نے جو پیسے خرچ کیے اس کی تفصیل کچھ یوں ہے:

دوپہر کا کھانا	40,000 دینار
بیگم کے لئے چمڑے کا پرس	35,000 دینار
اپنے لئے لیدر جیکٹ	75,000 دینار
خرم بیٹے کے لئے عراقی فوجی یونیفارم	15,000 دینار
بیٹیوں نفیسہ، شمائلہ اور سعدیہ کے لئے تحفے	75,000 دینار

اس طرح دو گھنٹوں میں، میں نے کوئی تین لاکھ دینار خرچ کر دیے۔
ان تین لاکھ دینار کی مالیت تین سو امریکی ڈالر یعنی دو سو پونڈ تھے۔ پاکستان کے تقریباً بیس ہزار روپے بنتے ہیں۔ اتنی رقم سے برطانیہ میں ایک لیدر جیکٹ بھی نہیں خریدی جا سکتی۔

خریداری کرتے اور گھومتے گھومتے ہم "مرجان" چوک پہنچے۔

علی بابا چالیس چور

مرجان چوک میں الف لیلیٰ ہزار داستان والی کہانی کے مجسمے نصب ہیں۔ یہ وہی کہانی ہے جسے دنیا "علی بابا چالیس چور" کے نام سے جانتی ہے۔ اس چوک میں علی بابا کی خادمہ مرجان کو دکھایا گیا ہے جو ایک اونچی جگہ کھڑی ایک مٹکے سے نیچے کے چالیس مٹکوں میں تیل ڈالتی دکھائی گئی ہے۔
اس منظر کو دیکھا تو مجھے بچپن میں پڑھی ہوئی کہانی یاد آئی کہ بغداد میں علی بابا نامی ایک صاحب رہتے تھے جو بہت غریب تھے ایک دن وہ اپنے گدھے کے ساتھ شہر کے نواح میں ایک ویرانے سے گزر رہے تھے کہ انہوں نے دیکھا کچھ لوگوں نے سر پر گٹھڑیاں اٹھائی ہوئی ہیں وہ پہاڑیوں میں اوجھل ایک دروازے کے سامنے رکے۔ پھر اُن کا ایک ساتھی جو غالباً اُن کا قائد تھا آگے بڑھا۔ اور دروازے کے سامنے کھڑے ہو کر کہا:

"کھل جا سم سم"

دروازہ کھل گیا اور وہ سب اپنی گھڑیاں اندر لے گئے اور دروازہ پھر بند ہو گیا۔ علی بابا یہ منظر دیکھ کر بہت حیران ہوا کہ یہ کیا ماجرا ہے۔ علی بابا چھپ کر انہیں دیکھتا رہا۔ کافی دیر بعد وہ باہر نکلے اور چلے گئے۔ اب علی بابا دروازے کے سامنے گیا اور کہا: "کھل جا سم سم" دروازہ کھل گیا۔ علی بابا اندر گیا تو کیا دیکھتا ہے کہ وہاں ہیرے جواہرات اور سونے چاندی کے ڈھیر لگے ہوئے ہیں۔

علی بابا ایک غریب آدمی تھا اس نے جی بھر کر دولت اٹھائی اور گھر لے آیا اور بعد میں حسبِ ضرورت وہاں سے دولت لالا کر اپنے حالات درست کرتا رہا۔ اس طرح غار میں چوروں نے جو دولت جمع کر رکھی تھی وہ آہستہ آہستہ علی بابا کے گھر آ گئی۔ جب چوروں کی غار خالی ہو گئی تو انہوں نے اس کا کھوج لگایا اور ڈھونڈتے ڈھونڈتے علی بابا کے گھر پہنچ گئے۔ چور وہاں آ کر مٹکوں میں چھپ گئے تاکہ رات کے اندھیرے میں علی بابا کے گھر سے اپنی دولت واپس لے جائیں۔

مرجان نامی خادمہ نے چوروں کو مٹکوں میں چھپتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ چنانچہ اس نے سرسوں کا تیل گرم کرنا شروع کر دیا۔ جب تیل اُبلنے لگا تو اس نے وہ تیل مٹکوں میں انڈیلنا شروع کر دیا جس کی وجہ سے وہ چور تیل میں جل کر مرنے لگے یوں مرجان نے چالیس چوروں کو مٹکوں میں تیل ڈال کر مار دیا۔

علی بابا چالیس چوروں کی اس کہانی کا ایک منظر، اب بھی مرجان چوک کی شکل میں لوگوں کو اس کہانی کی یاد دلاتا ہے جہاں مرجان مٹکوں میں تیل انڈیلتی نظر آتی ہے۔

علی بابا چالیس چوروں کے مجسموں کے علاوہ میں نے مشہور عرب فلاسفر عباس فرناس کا مجسمہ بھی ایک شاہراہ پر دیکھا۔ یہ وہی فلسفی تھا جس نے کوئی ہزار سال پہلے ہوائی جہاز کا نظریہ پیش کیا تھا کہ انسان لوہے پر بیٹھ کر اُڑ سکتا ہے۔ چنانچہ عراقی حکومت نے عباس بن فرناس کے مجسمہ کو پر کھولے ایک شاہراہ پر اس طرح نصب کیا ہوا ہے کہ شک ہونے لگتا ہے۔ کہ یہ اب اُڑا کہ اُڑا۔

ہم نے المنصور چوک میں بغداد شہر آباد کرنے والے مسلمان خلیفہ المنصور کے

مجسمہ کے علاوہ مشہور مسلمان فلسفی ابو یوسف اسحاق الکندی، مشہور عرب شاعر المتنبی، مشہور فلسفی اور فزکس کے ماہر ابو بکر محمد زکریا الرازی، مشہور ماہر لسانیات اور فلسفی الخلیل بن احمد الفرہادی، بابل کے مشہور بادشاہ حمورابی، مشہور مسلم فلاسفر الفارابی کے مجسمے بھی مختلف چوکوں میں دیکھے۔

چار بجے کے قریب ہم لبرٹی سکوائر یعنی آزادی چوک میں بیٹھ کر گرد و نواح میں چلنے والی ٹریفک کا نظارہ کرنے لگے۔ یہ چوک 14 جولائی 1958ء کے عراقی انقلاب کی یاد میں بنایا گیا ہے۔ چوک میں اوپر ایک بہت بڑا بورڈ نصب ہے جس پر عراق کے جاوید سلیم نامی ایک آرٹسٹ نے مختلف مجسمے بنائے ہوئے ہیں۔ اس چوک کا افتتاح 1961ء میں ہوا تھا۔ ہم اس چوک میں بیٹھے تھے کہ ہمارا گائیڈ ہمیں تلاش کرتا ہوا وہاں آ پہنچا۔

گائیڈ نے بتایا کہ سب لوگ سامرا کی سیاحت کے بعد واپس آ گئے ہیں اور بس میں ہمارا انتظار کر رہے ہیں۔ ہم وہاں سے اٹھے اور کوچ میں ساتھیوں سے جا ملے۔

ہمیں مل کر سب اس طرح خوش ہوئے جیسے ہم انہیں کافی دنوں کے بعد ملے ہوں۔ سعد نے مجھے گلے لگایا اور کہا: "برادر نظامی! ہم نے آج آپ کو بہت ہی مس کیا۔"

دن بھر کی باتیں ایک دوسرے کو سناتے سناتے ہم ایک ہوٹل گئے جہاں سب نے خوب سیر ہو کر کھانا کھایا۔

حضرت سلیمان فارسیؓ کا مزار

کھانے سے فارغ ہو کر ہم بغداد سے 30 کلو میٹر دور المدائین کے قصبے میں گئے۔ یہ قصبہ کافی پرانا ہے۔ اس کی شہرت کا سبب مشہور صحابی حضرت سلیمان فارسیؓ ہیں۔ حضرت سلیمان فارسیؓ ایک جلیل القدر صحابی تھے۔ جن کا تعلق ایران سے تھا لیکن حصول علم کے لئے گھر سے نکلے اور علم حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ کئی بار غلامی میں بھی جکڑے گئے۔ آخرکار وہ مدینہ منورہ میں ایک یہودی کے گھر پہنچے۔ مدینہ میں یہ یہودی کے کھجوروں کے باغات کی رکھوالی کیا کرتے تھے۔ حضرت سلیمان فارسیؓ الہامی کتابوں کے عالم تھے۔ انہیں علم تھا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام روح اللہ کے بعد ابھی آخری پیغمبر نے آنا ہے۔ چنانچہ انہیں آخری نبی کا شدت سے انتظار تھا۔ آخر وہ وقت آیا جب حضرت سلیمان فارسیؓ کو اس بات کا

علم ہوا کہ آخری نبی آ چکے ہیں اور وہ وہیں مدینہ میں قیام پذیر ہیں۔ چنانچہ حضرت سلیمان فارسیؓ حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ وسلم کے ہاں حاضر ہوئے اور حلقۂ اسلام میں داخل ہو گئے۔

تاریخ بتاتی ہے کہ حضرت سلیمان فارسیؓ کا مالک یہودی بڑا ظالم اور لالچی آدمی تھا۔ اُس نے انہیں آزاد کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ تاہم مسلمانوں کے بار بار اصرار کے بعد یہودی نے شرط لگائی کہ اگر وہ کھجور کے درخت ایک مقررہ تعداد میں لگا دیں تو اُنہیں آزاد کر دیا جائے گا۔

حضرت سلیمان فارسیؓ نے شرط مان لی۔ چنانچہ مدینہ کے مسلمانوں نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی قیادت میں یہودی کیلئے کھجوروں کے درخت لگائے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اپنے دست مبارک سے کچھ درخت لگائے تھے۔

حضرت سلیمان فارسیؓ جب آزاد ہوئے تو انہوں نے اپنے آپ کو اسلام کے لئے وقف کر دیا اور اصحاب صفہ میں شامل ہوئے۔

جنگ خندق کے موقع پر خندق کھودنے کی تجویز حضرت سلیمان فارسیؓ کی تھی۔ وہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے ترجمانی کے فرائض بھی انجام دیتے تھے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایران کے بادشاہ کو جو خط لکھا تھا وہ بھی فارسی میں حضرت سلیمانؓ نے لکھا تھا۔

میں اپنے قافلے کے ساتھ اس جلیل القدر صحابی کے مزار پر حاضر ہوا۔ مزار ایک مسجد کے ساتھ ہے اور خوبصورت اور صاف ستھرا ہے۔ میں نے جالی سے اندر جھانک کر دیکھا تو قبر پر نوٹوں کے ڈھیر پڑے تھے۔

حضرت سلیمان فارسیؓ کے مزار پر نوٹوں کے علاوہ میں نے سگریٹوں کے نذرانے چڑھتے بھی دیکھے۔

سگریٹ کے نذرانوں کے ساتھ کچھ ٹافیاں اور ایک پنسل بھی دیکھی۔ قبر کے سرہانے قرآنی رحل تھی۔ اس کے ساتھ موم بتیاں جلا کر رکھنے والا اسٹینڈ بھی دیکھا۔ قبر عرب روایات کے مطابق ہے جس کی اونچائی تین فٹ ہوگی۔ قبر پر سبز چادر اور مزار کے اوپر ٹین کی چھت ہے۔ روضے کے اردگرد جالی ہے۔ روضے کی لمبائی 24 فٹ اور چوڑائی بھی 24 فٹ ہوگی۔ زیارت کرنے والوں میں اکثریت اہل تشیع کی تھی۔ روضے پر حاضری دینے کے بعد ہم

متولی سے ملے اور اُسے کچھ عطیات دیئے۔ متولی نے جواباً ہمیں روضے کے کچھ عطیات دیئے۔ یہاں چالیس منٹ قیام کرنے کے بعد شام 6.40 پر ہم واپس بغداد کے لئے روانہ ہوئے۔

شام کو ہمیں کوچ پر پورے بغداد کی سیر کروائی گئی۔ کوچ ایک جگہ کھڑی ہوئی اور ہم کچھ پیدل بھی چلے۔ بعض ساتھیوں نے شاپنگ کی۔ حاجی کرامت حسین کا خالد بن ولیدؓ کے مزار پر جوتا چوری ہو گیا تھا۔ انہوں نے 13,000 دینار کا ایک جوتا خریدا۔ ہم رات نو بجے اپنے ہوٹل واپس آئے۔ اور آتے ہی سب سو گئے۔

جمعہ 26/نومبر 1999ء بغداد میں ہمارے قیام کا آخری دن تھا۔ صبح صبح مجھے فون آیا کہ ریسپشن میں ابو قاسم نامی ایک صاحب میرا انتظار کر رہے ہیں۔ میں نے انہیں اپنے کمرے میں بلا لیا۔ انہیں بغداد میں پاکستان کے سفارت کار راجہ اقبال صاحب نے میرے پاس بھیجا تھا۔ ان صاحب نے بتایا کہ وہ غریب آدمی ہیں۔ اُن کا تعلق حیدر آباد دکن سے تھا۔ کافی عرصہ قبل ترکِ وطن کر کے یہاں آ گئے تھے اور یہاں حضرت غوث الگیلانیؒ کے مزار پر رہتے ہیں۔

انہوں نے اپنے قیام کے دوران ایک مقامی عرب عورت سے شادی کر لی تھی۔ ملک کے قانون کے مطابق شادی کرنا مشکل تھا جس کے لئے حکومت کی منظوری ضروری تھی۔ مزار شریف کے گدی نشینوں کے اثر و رسوخ سے حکومت نے شادی کی اجازت دے دی لیکن اب وہ چھ بچوں کے باپ ہیں' غربت نے گھیرا ہوا ہے۔

میں نے ابو قاسم کی کہانی سنی اور حاجی کرامت صاحب سے کہہ کر اہالیان بریڈفورڈ کے عطیات سے اُن کی مالی مدد کروائی۔

مقام خضر علیہ السلام

ناشتے کے بعد پرانے شہر کے علاقہ الکرخ میں پہنچے۔ الکرخ میں دریائے دجلہ کے کنارے ایک مقام ہے جس کیلئے مقامی لوگوں کا دعویٰ ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت خضر علیہ السلام نے اس مقام سے اپنے اس سفر کا آغاز کیا تھا جس کا ذکر قرآن پاک

کی سورہ الکہف میں ہے۔
دریا کے کنارے ایک کچا دو منزلہ کمرہ تھا۔ جس کی حالت انتہائی خستہ تھی۔ اوپر کی منزل پر کمرہ میں ایک چٹائی تھی جس کے بارے میں مجاور یہ کہتے ہیں کہ یہاں حضرت خضر علیہ السلام نے آرام فرمایا تھا۔ نیچے والی منزل میں ایک جگہ موم بتیاں رکھی ہوئی تھیں۔ جہاں لوگ اپنی مرادیں مانگنے کیلئے وہاں سے ہی موم بتیاں خریدتے ہیں اور پھر وہیں جلا کر رکھ دیتے ہیں۔ لوگ موم بتیوں کا چڑھاوا چڑھاتے ہیں تو مجاور انہیں مہندی لگاتے اور سبز کپڑا پھاڑ کر دیتے ہیں اور لوگ انہیں پیسے دیتے ہیں۔

میں نے نہ تو موم بتی جلائی اور نہ مہندی لگوائی۔ مہندی تو میں نے شمیم کے ساتھ شادی والے دن لگوائی تھی۔ اب مزید مہندیوں کا شوق نہیں تھا۔

جب ہمارا زیارتی گروپ موم بتیاں جلا کر مہندی لگوانے میں مصروف تھا۔ میرا ذہن تاریخ کے اوراق میں گم تھا جن کے مطابق میں یہ فیصلہ کرنے پر مجبور تھا کہ یہ مقام خضر علیہ السلام نہیں ہے بلکہ اسے مقامی لوگوں نے جعلی طور پر پیسے کمانے کے لئے قائم کرلیا ہے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام مصر میں پیدا ہوئے اور زندگی کا بیشتر عرصہ وہ مصر میں رہے پھر وہ صحرائے سینا، کوہ طور پر گئے اور سفر کرتے ہوئے جب فلسطین میں پہنچے تو بحر مردار کے کنارے اللہ کو پیارے ہوئے۔ قرآن پاک اور تاریخ کی کسی کتاب میں کہیں ذکر نہیں کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کبھی بغداد تشریف لائے۔ قرآن پاک میں جہاں یہ قصہ مذکور ہے اس طرح تحریر ہے:

> (ذرا ان کو وہ قصہ سناؤ جو موسیٰؑ کو پیش آیا تھا) جبکہ موسیٰ نے اپنے خادم سے کہا تھا کہ "میں اپنا سفر ختم نہ کروں گا جب تک کہ دونوں دریاؤں کے سنگم پر نہ پہنچ جاؤں ورنہ میں ایک زمانہ دراز تک چلتا ہی رہوں گا۔" پس جب وہ ان کے سنگم پر پہنچے تو اپنی مچھلی سے غافل ہو گئے اور وہ نکل کر اس طرح دریا میں چلی گئی جیسے کہ کوئی سرنگ لگی ہو۔ آگے جا کر موسیٰؑ نے اپنے خادم سے کہا: "لاؤ ہمارا ناشتہ، آج کے سفر میں تو ہم بری طرح تھک گئے ہیں۔" خادم نے کہا "آپ نے دیکھا نہیں! یہ کیا ہوا؟ جب ہم چٹان

کے پاس ٹھیرے ہوئے تھے اس وقت مچھلی کا خیال نہ رہا اور شیطان نے مجھ کو ایسا غافل کر دیا کہ میں اس کا ذکر (آپ سے کرنا) بھول گیا۔ مچھلی تو عجب طریقے سے نکل کر دریا میں چلی گئی۔" موسیٰ" نے کہا: "اسی کی تو ہمیں تلاش تھی" چنانچہ وہ دونوں اپنے نقشِ قدم پر پھر واپس ہوئے اور وہاں انہوں نے ہمارے بندوں میں سے ایک بندے کو پایا جسے ہم نے اپنی رحمت سے نوازا تھا اور اپنی طرف سے ایک خاص علم عطا کیا تھا۔ (سورہ الکہف، رکوع 10)

ان آیات سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ یہ وہ جگہ نہیں ہے چونکہ یہاں دو دریاؤں کا کسی بھی جگہ سنگم نہیں۔ مفسرین کا خیال ہے کہ یہ واقعہ سوڈان کے شہر خرطوم کے قریب جہاں دریائے نیل کی دو بڑی شاخیں البحر الابیض اور البحر الازرق میں آ کر ملتی ہیں، وہاں پیش آیا تھا۔ بہر حال اس بارے میں اللہ تعالیٰ بہتر جانتے ہیں۔

اس مقام پر کھڑے ہو کر میں نے گرد و نواح کا جائزہ لیا تو مجھے دریائے دجلہ کے اس پار نئے شہر میں ڈیفنس منسٹری کی وہ عمارت نظر آئی جو اب کھنڈرات میں تبدیل ہو چکی ہے۔ حالیہ جنگ میں امریکہ نے بمباری کے ذریعے بہت سی دوسری عمارتوں کو نشانہ بنایا تو اس عمارت کو بھی زمین بوس کر دیا تھا۔

مقام خضر علیہ السلام کے بعد ہم اسی علاقے میں سید حبیب عجمی کے مزار پر حاضر ہوئے۔ مزار کا دروازہ بند تھا۔ ہمیں دیکھ کر ایک عرب عورت نے آ کر دروازہ کھولا۔ ہم نے یہاں فاتحہ پڑھی۔ مزار کے باہر ایک بورڈ لکھا تھا کہ: "سید حبیب عجمی کا تعلق اہل فارس سے تھا۔"

زبیدہ خاتون

10:55 بجے ہم زبیدہ خاتون کے مزار پر حاضر ہوئے۔ زبیدہ عباسی خلیفہ ہارون رشید کی چہیتی بیگم تھی۔ ہم نے آٹھویں جماعت میں زبیدہ خاتون اور ہارون رشید کے بارے میں پڑھا تھا۔

زبیدہ خاتون کا حکومت میں بالکل اسی طرح کا عمل دخل تھا جس طرح ملکہ نور جہاں کا جہانگیر کی حکومت میں تھا۔ زبیدہ ایک نیک دل خاتون تھی۔ اس نے مکہ میں حاجیوں کو پانی کی فراہمی کیلئے ایک نہر کھدوائی تھی۔

نہر زبیدہ کے آثار اب بھی موجود ہیں۔ صحرا میں نہر بنانا بڑا مشکل تھا۔ جب ماہرین نے زبیدہ کو کہا کہ اس نہر کی تعمیر پر بڑا خرچ ہوگا تو زبیدہ نے جواب دیا: "اگر ایک اینٹ کے بدلے ایک اشرفی خرچ کرنی پڑے میں تب بھی خرچ کروں گی۔" چنانچہ زبیدہ کے حکم پر مکہ میں نہر تعمیر ہوئی۔ جب میں 1989ء میں عمرہ کی ادائیگی کے لئے مکہ گیا تو میں نے میدانِ عرفات میں اس نہر کے نشانات دیکھے تھے۔

زبیدہ خاتون کا روضہ بھلے وقتوں میں بہت ہی خوبصورت تھا۔ روضے کے اوپر ایک خوبصورت مینار ہے۔ یہ مینار مجھے بالکل اسی طرح دکھائی دیا جس طرح منگلا ڈیم کا پانی خشک ہونے پر میرپور کے پرانے شہر کے وسط میں واقع مندر کا مینار دکھائی دیتا ہے۔

قبر اینٹوں کی بنی ہوئی ہے۔ جو زمین سے دو فٹ اونچی ہوگی۔ صفائی کا کوئی خاص انتظام نہیں۔ یہ قبر دیکھ کر مجھے لاہور میں واقع ملکہ نور جہاں کا مقبرہ یاد آیا۔ نور جہاں بھی زبیدہ خاتون کی طرح حسین و جمیل اور صاحب دانش خاتون تھی۔ زبیدہ خاتون کی طرح نور جہاں کا مقبرہ بھی کافی خستہ حالت میں ہے۔ گذشتہ سال جب میں پاکستان گیا تو اپنی بیگم شمیم، چھوٹے بھائی ڈاکٹر یوسف طارق، بھابی فاطمہ بتول، عزیزی آسیہ اور بشارت حسین صدیقی کے ہمراہ یہ مقبرے دیکھنے لاہور گیا تو ہم نے وہاں کافی تعداد میں بھینیس چرتی، جگہ جگہ گوبر اور گندگی کے ڈھیر دیکھے۔ یہ دیکھا تو خیال آیا کہ اگر مغل بادشاہ زندہ ہوتے اور یہ منظر اپنی آنکھوں سے دیکھتے تو ان بھینسوں کے مالک بیچاروں پر پتہ نہیں کیا عذاب نازل ہوتا!

بغداد میں بادشاہوں اور ان کی بیگمات کے مقبروں کا ایسا حشر دیکھ کر میں نے عبرت لی اور پھر قافلے کے ساتھ نماز جمعہ کی ادائیگی کے لئے سید الگیلانی " کے مزار پر واقع مسجد کی طرف روانہ ہوگیا۔

نماز جمعہ

ہم سب نے نماز جمعہ مسجد سید الگیلانی " میں ادا کی۔ مسجد کافی بڑی ہے جو نمازیوں

سے کھچا کھچ بھری ہوئی تھی۔ پہلی اذان کوئی ساڑھے گیارہ بجے ہوئی۔ پھر تلاوت قرآن پاک ہوتی رہی۔ دوسری اذان بارہ بجے ہوئی جس کے بعد امام صاحب نے خطبہ دیا۔ خطبہ عربی میں تھا جو میں مکمل نہ سمجھ سکا۔ جو مفہوم میں سمجھا اس کے مطابق خطبہ حب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آل رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں تھا۔ خطبہ کا دوسرا دور دعا کا تھا جس میں سب نے دعا کی۔ پھر نماز کے لئے سب کھڑے ہوئے۔ پہلے کھڑے ہو کر دعا مانگی اور پھر نماز پڑھی۔ دوران نماز سورہ فاتحہ کے بعد سب اونچی آواز میں آمین کہتے تھے۔ نماز کے بعد جب سلام پھیرا تو ہر نمازی نے دوسرے نمازی سے مصافحہ کیا۔ یعنی جب دائیں سلام پھیرا تو دائیں طرف والے نمازی کے ساتھ اور جب بائیں سلام پھیرا تو بائیں طرف والے نمازی کے ساتھ۔ لوگوں کی اکثریت فرضی نماز پڑھ کر چلی گئی۔

میں مسافر تھا۔ میں بھی فرضی نماز پڑھ کر باہر نکل آیا۔

نماز جمعہ کے بعد کا منظر

نماز کے بعد مسجد کے احاطہ میں نمازیوں نے آ کر بیٹھنا شروع کر دیا۔ جو گروپس کی شکل میں تھے۔ کچھ دوستوں کے ساتھ اور کچھ فیملیز کے ساتھ تھے۔ اب لوگوں نے کھانا نکال کر کھانا شروع کر دیا۔ ایک طرف نوجوانوں نے دف بجانا اور بھنگڑے ڈالنے شروع کر دیئے۔ نماز جمعہ کے بعد مسجد کا صحن ایک میلے کا منظر پیش کر رہا تھا۔

مسجد سے باہر نکلنے لگا تو بھکاری دشمن فوج کی طرح آن پیچھے پڑے۔ ان بھکاریوں سے جان بچانی مشکل ہوتی ہے۔ یوں آدمی مزار کے ساتھ جو محبت اور عقیدت لے کر جاتے ہیں اس عقیدت کا نشہ بھکاری ہرن کر دیتے ہیں۔ میں ان سے جان بچا کر غازی بن کر گاڑی میں آ بیٹھا' اسی طرح دوسرے نمازی بھی آئے لیکن "فرقہ' تصویریہ" غائب تھا۔

دیکھا گائیڈ دوڑتا آ رہا ہے۔ اس نے بتایا کہ حاجی غنی نے ہنگامہ برپا کر دیا ہے۔ اُن کا مطالبہ ہے کہ جب تک اُن کی نیاز والی دیگ کی ویڈیو فلم نہیں بن جاتی اس وقت تک وہ وہاں سے نہیں ہلیں گے۔

حاجی کرامت بولے: "بھائی جاؤ اور فلم بناؤ چونکہ اس نے یہ فلم ان لوگوں کو دکھانی ہے جنہوں نے اسے دیگ کے پیسے دیئے ہوئے ہیں۔"

چنانچہ ویڈیو مین وہاں گیا۔ فلم بنائی تو سب کی جان چھوٹی۔

امام الغزالی کا مزار

نماز جمعہ کے بعد کوئی ڈھائی بجے ہم امام الغزالی کے مزار پر حاضر ہوئے۔ یہ مقبرہ شیخ الگیلانی" کے مزار کے نزدیک ہے۔ مقبرہ ایک کمرہ کے اندر سادہ اور پروقار ہے۔ کمرے اور دیواروں کا رنگ سلیٹی تھا۔ قبر زمین سے ڈیڑھ فٹ اونچی تھی۔ جس پر سبز چادر تھی۔ یہ قبر پاکستان میں بنائی جانے والی قبروں کی طرح ہے۔ مقبرے کے ساتھ خادم کا کمرہ تھا جہاں امام غزالی کی تصانیف اور رسائل رکھے ہوئے تھے۔ وزٹنگ بک بھی تھی جہاں لوگ اپنے تاثرات لکھتے تھے۔ مجھے بھی یہ شرف حاصل ہوا۔

مقبرے کے متولی شیخ فاضل صاحب سے ملاقات کی۔ انہوں نے مجھے عربوں کے روایتی انداز سے گلے لگایا اور پھر رخصتی کے وقت اسی رسم کے مطابق بوسہ دے کر الوداع کیا۔

عراق میں یہ ہماری آخری زیارت تھی۔ اسی رات ہمیں اردن روانہ ہونا تھا۔ ہمارے پاس وقت کی قلت تھی اس لئے یہاں صرف پندرہ منٹ رہے۔ امام غزالی 450 ہجری کو طاہران میں ایک غریب گھرانے میں پیدا ہوئے۔ خاندان کا ذریعہ معاش کپڑے بننا تھا اسی مناسبت سے غزالی کہلائے۔ عربی میں غزال کا مطلب کاتنے سے ہے۔

امام الغزالی بہت بڑے فلسفی اور ماہر تعلیم تھے۔ ان کے علمی کارناموں کا آج یورپ بھی معترف ہے۔ امام الغزالی کے بغداد میں واقع مزار پر حاضری تو میں نے دی لیکن مجھے اس سلسلہ میں بھی کافی شک رہا۔ میرے علم کے مطابق امام الغزالی کا انتقال 505 ہجری میں طاہران میں ہوا تھا اور وہاں ہی دفن ہوئے تھے۔

مزاروں کی آمدن اور مسلم یونیورسٹی

بغداد کی زیارتوں سے فارغ ہو کر ہم گاڑی میں بیٹھ کر بازار کی طرف جانے لگے تو میرے ذہن میں ایک خیال پیدا ہوا کہ اب تک میں جتنے مسلمان ملکوں میں گھوما ہوں، سیاحت کی ہے اور مزاروں پر حاضری دی ہے ان سے پتہ چلتا ہے کہ لوگوں میں مالی اور جانی قربانی کا جذبہ موجود ہے۔ لیکن افسوس ہے کہ لوگوں کے اس جذبہ کو اجتماعی صورت میں استعمال میں نہیں لایا گیا۔ میں نے کچھ مزاروں پر اتنے پیسے دیکھے کہ قبریں پیسوں کے ڈھیر میں غائب تھیں۔ مجھے علم نہیں کہ ان پیسوں کو متولی صاحبان کس طرح اور کہاں خرچ کرتے ہیں لیکن اگر یہ پیسے جمع کر کے مسلمان دنیا میں آکسفورڈ اور کیمبرج کے معیار کی یونیورسٹیاں بنائی جائیں تو کوئی بڑی بات نہیں کہ چند سالوں کے بعد دنیا کی طاقت امریکہ اور یورپ سے نکل کر دوبارہ مسلمانوں کے ہاتھ آ جائے لیکن افسوس صد افسوس کہ حصول علم کی طرف ہمارے مسلمان اُس طرح توجہ نہیں دیتے جس طرح امام الغزالی، امام بخاری اور دوسرے جلیل القدر اماموں نے توجہ دی تھی۔ میں یہی سوچ رہا تھا کہ گاڑی بازار میں جا کھڑی ہوئی اور میں اپنی سوچوں سے نکل کر اپنے ساتھیوں کے ساتھ بازار کی ریل پیل میں کھو گیا۔

بغداد کا پرانا شہر

مجھے بغداد کا پرانا شہر دیکھنے کا شوق تھا لیکن اُدھر جانے کا موقع نہ ملا۔ روانگی سے قبل مجھے بچوں کے لئے تحفے خریدنے تھے۔ سب کے لئے تحفے تو خرید لیے تھے لیکن مجھے اپنی چہیتی بیٹی شمائلہ کے لئے لیدر جیکٹ خریدنی تھی۔ چنانچہ شام کے وقت سعد نے مجھے اپنے ساتھ ایک ٹیکسی میں بٹھایا اور بغداد کے قدیمی بازار میں لے گیا۔ وہاں گیا تو مجھے چوڑیاں بازار گوجرانوالہ کا منظر یاد آیا۔ اسی طرح دکاندار کھینچ کھینچ کر گاہکوں کو اپنا سامان دکھاتے اور خریدنے پر مجبور کرتے۔ بازار کی گلیاں تنگ اور بعض سڑکیں کچی تھیں۔ یہاں میں نے ایران کے لوگوں کو کافی تعداد میں شاپنگ کرتے دیکھا۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے بازار میں گاہکوں سے لیکر دکانداروں تک سب ہی اہل تشیع ہیں۔ سیاحوں کو شاپنگ پر کافی

پیسے خرچ کرتے دیکھ کر سعد نے مسکراتے ہوئے بتایا: ''ہم اہل عراق زیارتوں کو تیل کے کنوئیں اور سونے کی کان کہتے ہیں۔'' مارکیٹوں کے اندر چھوٹی دکانوں میں سیاحوں کا بے پناہ رش اہل عراق کی تیل کے کنوئیں والی بات کو سچا ثابت کر رہا تھا۔

الوداع بغداد

شام چار بجے سے رات آٹھ بجے تک سب شاپنگ کرتے رہے۔ بعد ازاں ہوٹل گئے۔ سامان باندھا اور ہوٹل سے نو بجے روانہ ہو گئے۔ پھر سعد ہمیں کھانا کھلانے ایک ریستوران میں لے گئے۔ کھانا کھایا' پھر وہ ہمیں اپنے گھر لے گئے جہاں سعد کی ہمشیرہ نے کوچ میں آ کر ہم سب کو سفر کے لئے کھانا دیا۔ سعد کی والدہ نے اپنے گھریلو باغات سے کھجوریں بھجوائیں۔

سعد کے خاندان سے مل کر مجھے دلی خوشی ہوئی۔ ہمارے درمیان اسلام کا ہی ایک رشتہ تھا جس نے ایک ہفتہ میں ہمارے درمیان اس قدر پیار محبت پیدا کر دی کہ رخصتی کے وقت سعد رو پڑے۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میں اپنے گھر سے رخصت ہو رہا ہوں۔ جہاں بہن بھائی ہمیں رخصت کر کے رو رہے ہیں۔

بغداد سے خوشگوار یادوں کو لئے ہم رات ساڑھے دس بجے گائیڈ کے ساتھ اردن کی طرف روانہ ہو گئے۔

بغداد سے اردن کی سرحد تک کا سفر 600 کلومیٹر ہے۔ یہ سفر ہم نے رات کے وقت طے کیا زیادہ تر سفر صحرا میں ہوا۔ ہر طرف صحرا ہی صحرا دیکھا۔ عراق کا یہ صحرائی صوبہ الغبر کہلاتا ہے۔ اس کی سرحدیں ایک طرف شام اور دوسری طرف اردن کے ساتھ ملتی ہیں۔ اس صوبہ کا دارالخلافہ رمدیہ (Ramadi) میں ہے۔ رات کو سفر کرتے ہوئے ہم صبح پانچ بجے اردن کی سرحد تربیل پر پہنچے۔ کوچ سے باہر نکلے تو انتہائی سردی تھی۔ سب کانپ رہے تھے۔ سردی دیکھ کر برطانیہ یاد آیا لیکن جب کسٹم حکام سے واسطہ پڑا تو پتہ چلا کہ ہم

ابھی عراق میں ہی ہیں۔

عراق کی سرحد پر ہمیں کوئی آٹھ گھنٹے رکنا پڑا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ہمارے ڈرائیور کے پاس پاسپورٹ نہیں تھا کہ وہ گاڑی چلا کر ہمیں اردن میں اس مقام پر لے جائے جہاں دوسری گاڑی ہمارا انتظار کر رہی تھی۔ آٹھ گھنٹے میں قافلے کے اکثر آدمی سخت بے چین ہوئے۔ اسی دوران حاجی غنی کو بیت الخلا جانے کی حاجت ہوئی تو حکام نے بیت الخلا جانے سے روک دیا۔ حاجی غنی سخت خفا تھے۔ انہوں نے سب کے سامنے بیٹھ کر پیشاب کرنے کی کوشش کی تو حکام سمجھ گئے کہ معاملہ خاصا پیچیدہ ہے۔ انہوں نے سب کو ٹائلٹ استعمال کرنے کی اجازت دے دی۔

صبح کا وقت تھا۔ دفاتر بند تھے۔ جب نو بجے دفاتر کھلے تو ہماری بات پر غور شروع ہوا۔ میں گاڑی میں بیٹھا آرام سے اپنے سفری نوٹس بناتا رہا۔ آخر ایک پولیس مین آیا اس نے میرا اور حاجی کرامت حسین کا نام پکارا کہ آپ کو کمانڈر صاحب بلا رہے ہیں۔

ہم دونوں کمانڈر کے دفتر میں گئے۔ کمانڈر کا نام مقدم رفعت محمد محمود تھا جو لگ بھگ پچاس سال کی عمر کا ایک سمارٹ، دبلا پتلا آدمی تھا۔ اس کی صدام کی طرح مونچھیں تھیں۔ اس نے ہمیں چائے پلائی اور معذرت کی کہ ہمارے قافلے کو یہاں انتظار کرنا پڑا۔ پھر اس نے ہماری موجودگی میں اردنی حکام کو فون کیا، ہمارے ساتھ حسنِ سلوک کی سفارش کی اور اپنا ایک سپاہی ہمارے ساتھ لگایا جو ہمیں اردن کی سرحد تک لے گیا۔

اردن میں

جب ہم اردن میں داخل ہوئے تو اردن سے آنے والی گاڑی اور گائیڈ ہمارا انتظار کر رہے تھے۔ گائیڈ ایک چست اور چالاک آدمی تھا اس نے فوراً ہمارے ویزوں کا بندوبست کروایا۔ جلد ہی ہمیں جانے کی اجازت مل گئی۔ ہم ہفتہ کے روز دن کے ایک بج کر بیس منٹ پر اردن میں داخل ہوئے۔

اردن میں داخل ہوئے تو پہلی تبدیلی یہ دیکھی کہ ہمیں لے جانے والی گاڑی نئی تھی۔ عراق میں گاڑیاں پرانی تھیں۔ اردن کے صحرا میں 80 کلومیٹر سفر کرنے کے بعد ہم ریوست کے شہر میں پہنچے۔ یہ علاقہ کسی زمانے میں عراق کا تھا لیکن جب اسرائیل نے اردن کے کچھ علاقے پر قبضہ کر لیا تو عراق نے بھائی چارے کی بناء یہ علاقہ اردن کو تحفے میں دے دیا۔ ریوست میں ہم 2.45 بجے پہنچے۔ یہاں ہم نے ایک دو منزلہ ہوٹل میں کھانا کھایا۔ کھانا لذیذ تھا۔ کھانے کے بعد میں نے قریب ہی ایک پبلک کال آفس سے برطانیہ میں بیگم سے فون پر بات چیت کی۔ عراق کے قیام کے دوران بین الاقوامی پابندیوں کی وجہ سے ہم فون نہ کر سکے تھے۔

کھانے کے بعد ہم نے اپنا سفر دوبارہ شروع کیا۔ پروگرام کے مطابق ہمیں اردن کے دارالخلافہ عمان پہنچنا تھا اور وہاں سے اسرائیل جانا تھا لیکن عراقی سرحد پر بہت وقت ضائع ہو گیا تھا اس لئے گائیڈ نے مشورہ دیا کہ ہم سدون کی پہاڑیوں سے ہوتے ہوئے اسرائیل میں داخل ہوں۔

چنانچہ ہم نے سدون کی طرف سفر شروع کر دیا۔ ہمارا یہ سفر بھی صحرا کے بیچوں بیچ ہو رہا تھا۔ ہمارے دائیں طرف بحیرۂ روم تھا اور بائیں طرف صحرا۔ ریوست سے کوئی بیس میل کا فاصلہ طے کر کے ہم اس مقام پر پہنچے جہاں کسی زمانے میں آتش فشاں پھٹا تھا۔ اس کے آثار اب بھی جگہ جگہ نظر آ رہے تھے۔ آخرکار ہم اردن کے شہر اربد پہنچے۔

معاذ ابن جبلؓ صحابی رسول کا مزار

اربد کے بعد صحرا ختم ہوا اور سدون کا پہاڑی سلسلہ شروع ہو گیا۔ چھوٹی چھوٹی پہاڑیوں کے درمیان سفر کرتے ہوئے جب ہم اس مقام پر پہنچے جہاں سے اسرائیل کی سرحد پندرہ کلومیٹر تھی تو گائیڈ نے بتایا کہ یہاں معاذ ابن جبلؓ صحابی رسول صلی اللہ علیہ و سلم کا مزار ہے۔ وقت کی قلت تھی اور اندیشہ تھا کہ کہیں اسرائیل کی سرحد بند نہ ہو جائے۔

اس لئے ہم نے بس ہی میں فاتحہ خوانی کی۔

سرحد پر ہمارے اردن والے گائیڈ نے ہم سے اجازت لی۔اسرائیلی حکومت سامان کی چیکنگ کے دوران سخت تنگ کرتی ہے۔ چنانچہ فیصلہ یہ ہوا کہ ایک دن کے لئے ضروری سامان ساتھ رکھ لیا جائے اور بھاری سامان عمان بھیج دیا جائے۔گائیڈ ہمارا سامان لے کر واپس چلا گیا اور ہم نے ایک بس والے کو ایک پونڈ فی آدمی کرایہ ادا کیا جس نے ہمیں اردن کی سرحد سے اسرائیل کی سرحد کے درمیان والے علاقہ کو عبور کروا کر اسرائیلی چیک پوسٹ پر پہنچا دیا۔

❁ ❁ ❁

غوث الاعظمؒ کے مزار کی چادر قافلہ کو تحفہ میں دی گئی۔

بائیں مصنف، انکے ساتھ حاجی کرامت حسین، غوث الاعظمؒ کے گدی نشین، پاکستانی سفارت کار راجہ اقبال،

یونس اویسی، حاجی [illegible]
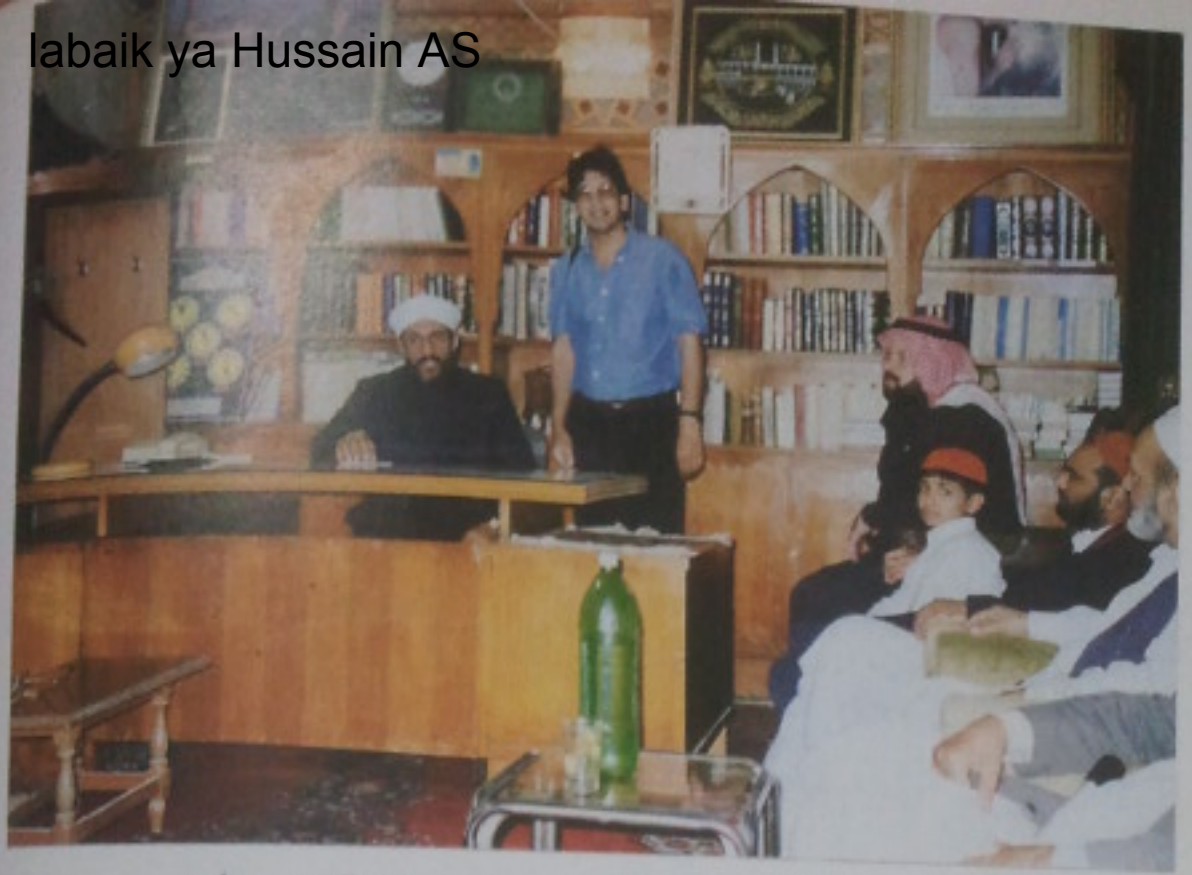
مصنف امام ابوحنیفہ" کے مزار پر خطاب کر رہا ہے۔ ساتھ مسجد ابوحنیفہ" کے امام بیٹھے ہیں۔

بغداد میں عباس بن فرناس کا مجسمہ جس نے دنیا کو ہوائی جہاز کا تصور دیا۔

بغداد شہر کا ایک منظر۔ شاہراہ پر صدام حسین کا فوٹو بھی نظر آ رہا ہے۔

دائیں یاسین عمار، مصنف، عراقی پولیس مین، حاجی کرامت حسین اور ہمارے میزبان سعد

مصنف امام الغزالی کے مزار کے باہر کھڑا ہے۔

شیخ عمر جنید بغدادیؒ کے مزار کے متولی کی گالیوں کا زور و شور سے جواب دے رہا ہے۔ ساتھ مصنف کھڑا حالات کا جائزہ لے رہا ہے۔

کربلائے معلیٰ میں حضرت امام حسینؓ کے روضے کا ایک منظر۔
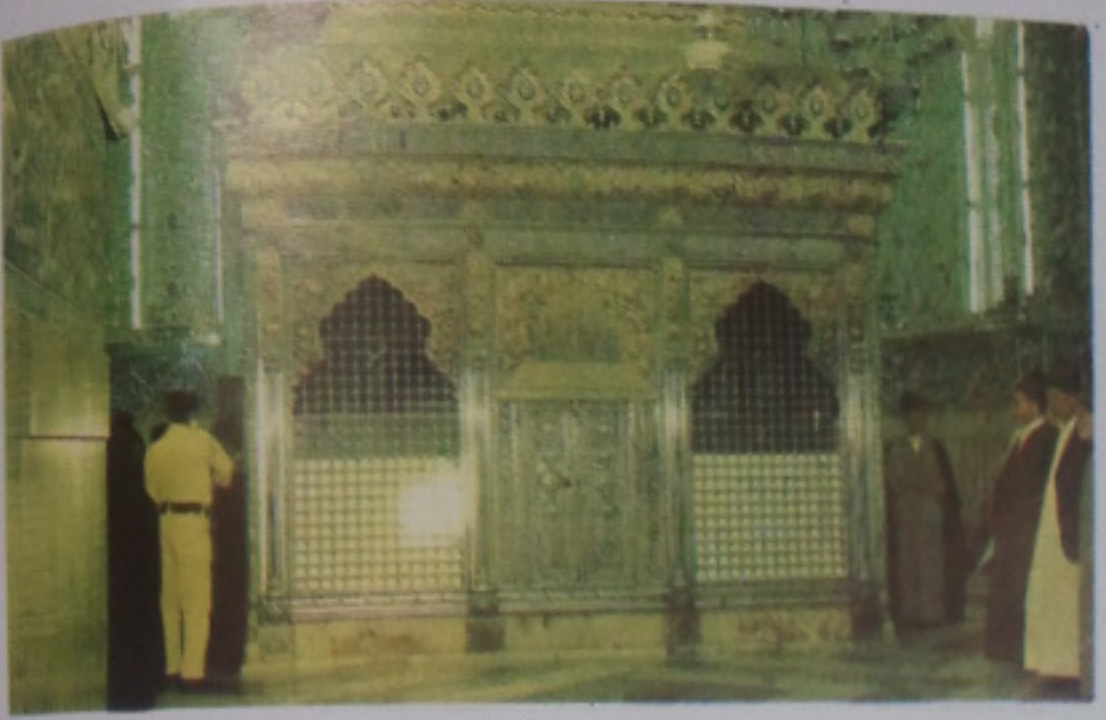
حضرت امام حسینؑ کا روضہ۔

حضرت امام حسینؑ کے روضہ کا سنہری دروازہ
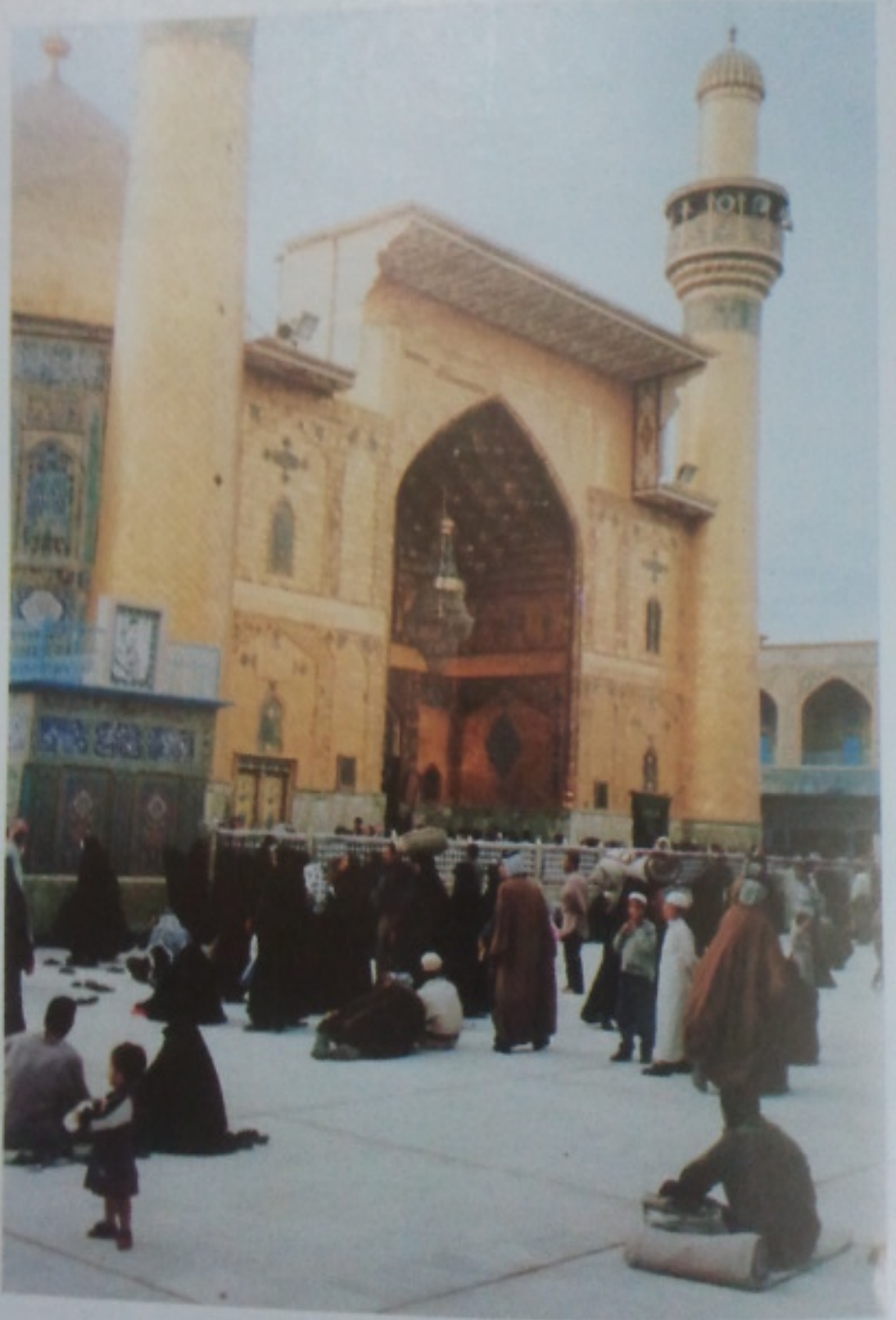
حضرت علیؑ کے روضہ کا بیرونی منظر، دور دور تک لوگ نظر آرہے ہیں۔
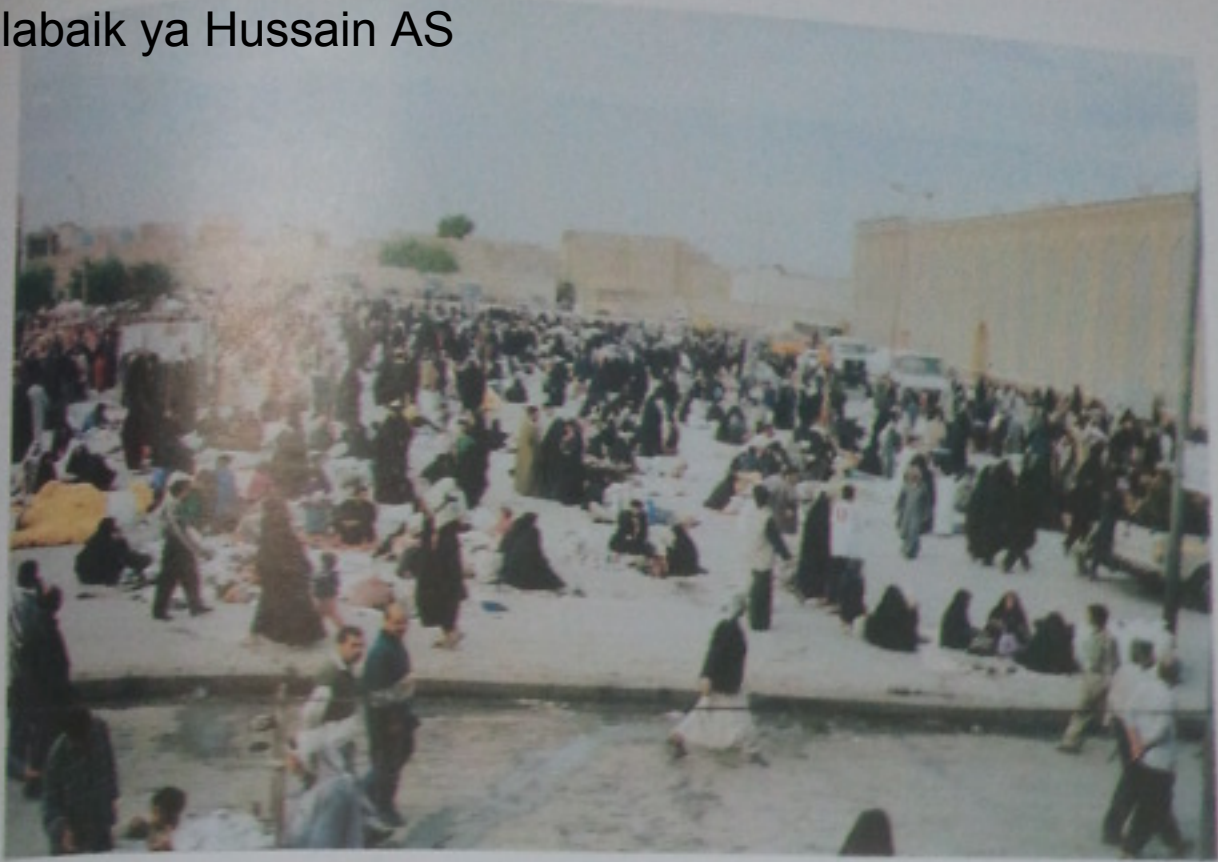
حضرت علیؑ کے روضہ کے احاطے کا ایک منظر۔

حضرت علیؑ کے [illegible]

بغداد شہر کے درمیان دریائے دجلہ کا صبح کا ایک دلفریب منظر۔

بغداد کے پرانے شہر کا ایک منظر۔

بغداد میں مچھلی پکانے کا نیا اور انوکھا انداز۔

روایت ہے کہ یہ مقام خضر ہے جہاں حضرت موسیٰؑ سے انکی ملاقات ہوئی تھی۔

بابل کے تاریخی شہر کے مین گیٹ پر ہمارا قافلہ' درمیان میں ہمارے میزبان سعد۔

مصنف بابل کے پرانے شہر کے اندر اس جگہ کھڑا ہے جہاں سکندر اعظم فوت ہوئے تھے۔

نجف اشرف میں حضرت علیؑ کے روضہ کا ایک منظر۔

وفد کے ارکان روضہ حضرت علیؑ کے متولی کے ساتھ انکے دفتر میں۔

القدس

- ☆ اسرائیل
- ☆ بیت المقدس
- ☆ حبرون
- ☆ بیت اللحم
- ☆ فلسطین

امن کی فاختہ

اسرائیل کے علاقہ میں داخل ہوتے ہی ہمیں سب سے پہلے "امن کی فاختہ" کا نشان نظر آیا۔ امن کے اس نشان کے نیچے اسرائیلی فوجی بندوقیں تانے مسافروں کو شک کی نظروں سے دیکھتے، ان کا مکمل جائزہ لیتے اور پھر انہیں ایک جگہ بٹھا دیتے تھے۔

ہمیں بھی ایک بڑے ہال میں بٹھا دیا گیا۔ فوجی یونیفارم میں ملبوس یہودی لڑکے اور لڑکیاں ہمارا طواف کرتے، ہمیں مشکوک نظروں سے دیکھتے، چہروں کا جائزہ لیتے اور پھر جا کر کوڑا کرکٹ والے ڈبے ٹٹولتے۔ اس شک سے کہ ممکن ہے ہم میں سے کسی نے بم رکھ کر اسرائیل کی سلامتی کو خطرے میں ڈال دیا ہو۔

ان فوجیوں اور دوسرے آفیسروں کو دیکھ کر مجھے یوں محسوس ہوا جیسے ایٹمی طاقت کی حامل اس قوم کے حواس اڑے ہوئے ہیں۔ امریکہ اور یورپ ان کی پشت پر ہیں۔ پورا ملک جدید ترین اسلحہ سے لیس ہے۔ گذشتہ پچاس سالوں سے مسلمانوں پر ظلم بھی کر رہے ہیں۔ فلسطینیوں کے ملک پر قبضہ کیا ہوا ہے۔ 1967ء کی عرب اسرائیل جنگ میں مسلمانوں کو بری طرح شکست بھی دے چکے ہیں۔ لیکن ہر طرح کی بالا دستی کے باوجود ان پر ایک خوف، ہراس، بے سکونی اور بے چینی طاری تھی۔

اسرائیلیوں کی بے چینی دیکھ کر مجھے ایک لطیفہ یاد آیا:

ایک شخص دوسرے کو گرا کر اُس کی پشت پر بیٹھا رو رہا تھا۔ یہ صورت حال دیکھ کر کسی نے پوچھا:

میاں! آپ نے اسے پچھاڑا ہوا ہے۔ اسے مار رہے ہیں اور پھر بھی آپ رو رہے ہیں' کیوں؟

اس پر اس نے کہا: "مجھے ڈر ہے کہ جب میں اسے چھوڑوں گا تو یہ مجھے مارے گا۔"

بالکل ایسی ہی صورت حال میں اسرائیل مبتلا ہیں۔

آج مجھے ایمان کی قوت اور دشمن کے مصنوعی دبدبے کو قریب سے دیکھنے، پرکھنے اور جانچنے کا موقع ملا۔

ہم میں سے کوئی ٹائلٹ جاتا تو فوجی نوخیز لڑکے اور لڑکیاں فوراً وہاں پہنچ جاتے، اِدھر اُدھر سونگھتے اور جب اچھی طرح تسلی ہو جاتی تو سکھ کا سانس لیتے تھے۔

میں نے وہاں کچھ عرب بھی دیکھے۔ جنہیں اسرائیلیوں نے لمبی لمبی قطاروں میں کھڑا کر رکھا تھا۔

اس طرح پہلی بار میں نے "امن کی فاختہ" کے سائے میں بدامنی، زیادتی اور ظلم کے مناظر دیکھے اور امن کا مذاق اڑتے دیکھا۔

خوف و ہراس کی اس فضا میں دفعتاً ایک اسرائیلی افسر وارد ہوا۔ اُس نے یہ خوشخبری دی کہ آپ کو اسرائیل میں داخل ہونے کی اجازت دی جاتی ہے۔ اپنا اپنا پاسپورٹ وصول کیجئے' سامان اٹھایئے اور تشریف لے جایئے۔

ہم نے پاسپورٹ لیے جن کے ساتھ بورڈنگ کارڈ نما ایک فارم بھی تھا جس پر اسرائیل میں داخلے کی مہر اور ویزا ثبت تھا۔ مہر اور ویزا ہمارے پاسپورٹ پر نہیں لگایا گیا کیونکہ اس طرح ہمیں اسلامی ممالک میں داخل ہونے میں دشواری پیش آ سکتی ہے جس کا اسرائیل کو علم ہے۔

ہم نے پاسپورٹ سنبھالے' سامان اٹھایا اور اسرائیل کے علاقے میں داخل ہوئے۔ باہر درمیانے قد کے ایک صاحب کو ٹوپی اور سوٹ پہنے اپنے انتظار میں پایا۔ یہ صاحب اسرائیل، بیت المقدس اور فلسطین کے سفر کے لئے ہمارے گائیڈ تھے۔

ہم سامان کوچ میں رکھ کر بیٹھے تو گائیڈ نے سفر پر روانہ ہونے والی وہ دعا مانگی جو

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم مانگا کرتے تھے۔

سبحان الذی سخر لنا ھذا وما کنا لہ مقرنین وانا الی ربنا لمنقلبون

ترجمہ: پاک ہے وہ جس نے ہمارے لیے ان چیزوں کو مسخر کر دیا
ورنہ ہم انہیں قابو میں لانے کی طاقت نہ رکھتے تھے اور ایک روز
ہمیں اپنے رب کی طرف پلٹنا ہے۔ (سورہ الزخرف آیت ۱۳)

دعا مانگنے کے بعد گائیڈ نے ڈرائیور کو گاڑی چلانے کا حکم دیا۔ گاڑی چلی تو گائیڈ نے بتایا:

"میرا نام محمد جیلانی ہے۔ ڈرائیور کا نام محمد اسماعیل ہے۔ ہم دونوں فلسطینی مسلمان اور مہاجر ہیں۔ سرحد سے ہم سفر کرتے ہوئے دو گھنٹے میں بیت المقدس پہنچیں گے۔"

گاڑی رات کے ساڑھے نو بجے چلی اور دو گھنٹے کے بعد رات کے ساڑھے گیارہ بجے بیت المقدس پہنچی۔

بیت المقدس میں ہمارا قیام منڈل سٹریٹ (MENDELE STREET) میں واقع ہوٹل ونڈمل (WINDMILL) میں تھا۔ ہوٹل کی دوسری منزل پر میرا کمرہ نمبر 206 تھا۔ ظہور یہاں بھی میرے روم میٹ تھے۔

ہم مسلسل دو دن سے سفر کر رہے تھے اس لئے ہوٹل پہنچتے ہی سو گئے۔

پیغمبروں کی سرزمین

مسلسل سفر کے بعد خیال تھا کہ اگلے دن اٹھنا مشکل ہو گا لیکن میں حسب معمول صبح سویرے اٹھ بیٹھا۔ یہ اتوار 28/نومبر 1999ء کی ایک خوبصورت صبح تھی۔ غسل کیا کپڑے پہنے اور تر و تازہ ہو کر ہوٹل کے ڈائننگ ہال میں پہنچا تو سارے ساتھیوں کو ناشتہ میں مصروف دیکھا۔

ڈائننگ ہال کے درمیان میں ایک بڑی میز پر طرح طرح کے کھانے سجے تھے۔ لوگ ان میں سے اپنی مرضی کا کھانا پلیٹ میں ڈالتے اور مزے لے لے کر کھاتے۔

سب نے پیٹ بھر کر کھایا۔ سفر میں پہلی بار اس طرح کا ناشتہ مل رہا تھا۔ ورنہ اب

تک تو کھانے کے سلسلہ میں لڑائی جھگڑا ہی ہوتا رہا تھا۔

ہم ناشتہ سے فارغ ہوئے تو حاجی یونس اویسی صاحب نے اعلان کیا کہ باہر کوچ کھڑی ہے تشریف لے چلیے۔

ہوٹل سے نکل کر صبح کی روشنی میں بیت المقدس پر پہلی نظر ڈالی تو ایک دل فریب منظر دیکھا۔ صبح سورج کی پہلی کرن جب اس مقدس شہر پر پڑتی ہے تو ڈھلوان پر بنے ہوئے مکان سورج کی کرنوں کو منعکس کر کے پورے ماحول میں ایک ایسا مسرور کن منظر پیش کرتے ہیں کہ انسان حیران اور دنگ رہ کر اللہ کی حمد وثناء میں مصروف ہو جاتا ہے۔

آج بھی ہمارے گائیڈ محمد جیلانی تھے۔ انہوں نے دعا مانگی اور ڈرائیور کو چلنے کا حکم دیا۔ جوں ہی گاڑی چلی محمد جیلانی کی زبان بھی چلنا شروع ہوگئی۔

ہم آپ کو ''پیغمبروں کی سرزمین'' اور اس مقدس شہر میں خوش آمدید کہتے ہیں۔ یہ مقدس شہر موریہ، صیہون اور زیتون نامی پہاڑیوں پر آباد ہے۔ موجودہ آبادی 1,80,000 افراد پر مشتمل ہے۔ شہر کے اردگرد ابھی تک وہی دیوار موجود ہے جسے عثمانیوں نے شہر کی حفاظت کے لئے تعمیر کروایا تھا۔ زیتون کی پہاڑی موریہ کے بالکل سامنے ہے۔ اس پر آبادی کی بجائے زیتون اور انجیر کے درخت، کھیت کھلیان اور چراگاہیں ہیں۔

بیت المقدس دنیا کا قدیم ترین شہر ہے۔ یہ دنیا کا واحد شہر ہے جو یہودیوں، عیسائیوں اور مسلمانوں کے لئے یکساں مقدس اور محترم ہے۔ بیت المقدس کے ہر مکان، گلی، محلہ بلکہ ہر پتھر اور اینٹ کے ساتھ ایک تاریخ وابستہ ہے۔

جتنا یہ شہر قدیم اور مقدس ہے اتنا ہی اس پر ظلم ہوا۔ یہ شہر کئی بار تباہ و برباد ہوا، اجڑا پھر آباد ہوا۔ جتنے انقلاب اس شہر میں آئے اتنے انقلاب کسی اور شہر نے نہیں دیکھے۔ مختلف وقتوں میں شہر کے نام بھی بدلتے رہے۔ موجودہ نام یروشلم حضرت داؤد علیہ السلام نے رکھا تھا۔

جس زمانے میں لوگ ایک جگہ رہنے کی بجائے تلاش معاش میں چل پھر کر زندگی بسر کیا کرتے تھے۔ عرب سے آل سام کا ایک قبیلہ جو کنعانی، کنعی یا فونیقی کہلاتا تھا 2500 قبل مسیح میں یہاں آکر آباد ہوا۔ پھر کوئی چار ہزار سال پہلے حضرت ابراہیم علیہ السلام عراق

کے شہر اُر (Ur) سے' جو دریائے فرات کے کنارے آباد تھا' ہجرت کر کے یہاں آباد ہوئے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے ایک بیٹے حضرت اسماعیل علیہ السلام کو مکہ میں اور دوسرے بیٹے حضرت اسحاق علیہ السلام کو بیت المقدس میں آباد کیا۔ حضرت اسحاق علیہ السلام کے بیٹے حضرت یعقوب علیہ السلام تھے' جن کا نام اسرائیل بھی تھا۔ اس لئے ان کی اولاد بنی اسرائیل کہلائی۔ حضرت یعقوب علیہ السلام، حضرت یوسف علیہ السلام، حضرت داؤد علیہ السلام، حضرت سلیمان علیہ السلام، حضرت یحییٰ علیہ السلام، حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور بہت سے دیگر پیغمبر اس سرزمین میں پیدا ہوئے یا باہر سے آ کر یہاں آباد ہوئے۔ اسی مناسبت سے یہ خطہ ''پیغمبروں کی سرزمین'' کہلاتا ہے۔

شروع میں بنی اسرائیل کی کوئی مرکزی حکومت نہیں تھی۔ یہ چھوٹے چھوٹے علاقوں میں اپنے مقامی سرداروں کے زیر اقتدار زندگی بسر کرتے تھے۔ حضرت سموئیلؑ جو نبی اللہ بھی تھے پہلے اسرائیلی بادشاہ تھے جنہوں نے کافی عرصہ اس خطہ پر حکومت کی۔ جب حضرت سموئیلؑ بوڑھے ہو گئے تو بنی اسرائیل نے فرمائش کی کہ ان کے لئے جوان اور طاقت ور بادشاہ نامزد کیا جائے تاکہ وہ اللہ کے نام پر جالوت سے' جو بہت طاقت ور کافر تھا' جنگ کرے۔ قوم کی فرمائش اور اللہ کے حکم سے حضرت سموئیلؑ نے حضرت طالوتؒ کو بادشاہ مقرر کیا۔

روایت ہے کہ ایک دن حضرت طالوتؒ اپنے باپ کے گم شدہ گدھے تلاش کرتے کرتے حضرت سموئیلؑ کے علاقہ میں آ گئے۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت سموئیلؑ کو اشارہ کیا کہ یہی تمہارا جانشین ہے۔ چنانچہ اللہ کے حکم پر حضرت سموئیلؑ نے طالوت کو اپنا جانشین اور اسرائیل کا بادشاہ مقرر کیا۔

حضرت طالوتؒ کی نامزدگی کو بنی اسرائیل نے قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ جس کا ذکر قرآن پاک پارہ دوم سورہ البقرہ میں اس طرح ہے:

''یہ سن کر وہ بولے: ہم پر بادشاہ بننے کا وہ کیسے حقدار ہو گیا؟ اس کے مقابلے میں بادشاہی کے ہم زیادہ مستحق ہیں۔ وہ تو کوئی مالدار آدمی نہیں۔ نبی نے جواب دیا: اللہ نے تمہارے مقابلے میں اسی کو منتخب کیا ہے اور اس کو علمی و جسمانی دونوں قسم کی اہلیتیں فراوانی کے ساتھ عطا

فرمائی ہیں۔ اور اللہ کو اختیار ہے کہ اپنا ملک جسے چاہے دے اللہ بڑی
وسعت رکھتا ہے اور سب کچھ اس کے علم میں ہے۔"

حضرت طالوت ؑ کی حکومت 1020 قبل مسیح سے 1004 قبل مسیح تک رہی
جنہوں نے جالوت سے جنگ کر کے اسے مغلوب کیا اور اللہ کے وعدہ کے مطابق وہ صندوق
(تابوت سکینہ) واپس لیا جس میں حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت ہارون علیہ السلام کے
تبرکات تھے، جو بنی اسرائیل کی غفلت سے ان کے ہاتھوں سے نکل گیا تھا۔

حضرت طالوت ؑ کے فوت ہونے کے بعد بنی اسرائیل نے حضرت داؤد علیہ السلام
کو اپنا بادشاہ بنایا۔ انہوں نے اپنا دارالخلافہ پہلے الخلیل یعنی حبرون میں اور بعد میں بیت
المقدس میں منتقل کر دیا۔ حضرت داؤد علیہ السلام نے 1004 قبل مسیح سے 965 قبل مسیح تک
33 سال حکومت کی۔

حضرت داؤد علیہ السلام کی وفات کے بعد ان کے بیٹے حضرت سلیمان علیہ السلام
نے 965 قبل مسیح میں حکومت سنبھالی جو 926 قبل مسیح تک قائم رہی۔

حضرت سلیمان علیہ السلام کی وفات کے بعد اسرائیل کی متحدہ ریاست دو حصوں
سامریہ اور یہودیہ میں تقسیم ہوگئی۔ دونوں ریاستوں نے آپس میں لڑنا اور ایک دوسرے کو
قتل کرنا شروع کر دیا۔ جب بنی اسرائیل اس طرح آپس میں دست وگریباں تھے تو بابل
کے بادشاہ بخت نصر نے 598 قبل مسیح میں حملہ کر کے یروشلم سمیت تمام علاقہ فتح کر لیا۔ شہر
کی اینٹ سے اینٹ بجا دی۔ ہیکل سلیمانی کو مسمار کر کے بادشاہ اور ہزاروں شہریوں کو
گرفتار کر کے بابل میں قید کر دیا۔ بابل کی اسی قید میں ہاروت و ماروت فرشتے بنی اسرائیل
کے پاس آئے تھے۔

539 قبل مسیح میں ایران کے بادشاہ کسریٰ خسرو نے بابل فتح کیا۔ بابل کے
قیدیوں کو رہا کیا اور لوٹا ہوا مال واپس دے کر یروشلم بھیجا۔

332 قبل مسیح میں یروشلم پر سکندر اعظم نے قبضہ کیا تو لوگوں نے شہر سے باہر آ کر
اس کا استقبال کیا۔ 170 قبل مسیح میں اس شہر پر یونانیوں نے قبضہ کیا۔ 40 قبل مسیح میں
رومیوں نے یروشلم پر قبضہ کیا۔

شہر سے نکل کر اس شاہراہ پر آ چکی ہے جو حبرون یا الخلیل کو جاتی ہے۔ یہاں سے ہم سیدھے الخلیل جائیں گے۔

میں نے دیکھا کہ شہر میں داخل ہونے والی ٹریفک کو اسرائیلی فوجی روکے ہوئے ہیں۔ فوجی گاڑیوں میں داخل ہو کر ایک ایک مسافر کو چیک کرتے اگر کسی پر شک ہوتا تو اُسے اُتار لیتے یا گرفتار کر لیتے۔

میں نے گائیڈ سے پوچھا: ''یہ کیا ماجرا ہے۔''

محمد جیلانی نے بتایا کہ یہ فلسطینی مہاجر ہیں جنہیں یہودیوں نے اپنے علاقے سے نکال کر ان کے گھروں اور جائیدادوں پر قبضے کر لیے ہیں۔ جن گاڑیوں کی چیکنگ ہو رہی ہے۔ ان میں فلسطینی مہاجر ہیں جو محنت مزدوری کے لئے ہر روز بیت المقدس جاتے ہیں۔ یہودیوں نے انہیں ان کے وطن سے نکالا اور اب انہیں روزی کمانے سے بھی روک رہے ہیں۔

اسرائیلی فوج بعض اوقات ان کی گاڑیوں کو دو دو گھنٹے بلکہ پورا پورا دن بھی کھڑا رکھتی ہے اور جب انہیں یقین ہو جائے کہ اب اگر یہ شہر جائیں گے تو بھی انہیں روزگار نہیں ملے گا تب انہیں جانے کی اجازت دی جاتی ہے۔

یوں فلسطینی مہاجر ہر روز یہاں سرحد پر آ کر دھکے کھاتے، رسوا ہوتے اور اپنی غیرت کا خون کرتے ہیں۔ یہ حالت زار دیکھی تو مجھے علامہ اقبال یاد آئے' اُنہوں نے شاید اسی صورت حال کے بارے میں کہا تھا کہ:

تیرے دریا میں طوفاں کیوں نہیں ہے؟
خودی تیری مسلماں کیوں نہیں ہے؟
عبث ہے شکوۂ تقدیر یزداں
تو خود تقدیر یزداں کیوں نہیں ہے؟

میں نے محمد جیلانی سے پوچھا: ''فلسطین کی وہ ریاست کہاں ہے جس کا یاسر عرفات اعلان کرتا پھرتا ہے۔''

محمد جیلانی نے بتایا کہ یاسر عرفات کی ریاست زمین پر تو قائم نہیں البتہ کاغذوں اور

اخبارات کے صفحوں پر ضرور موجود ہے۔"

پھر غصے میں آ کر جیلانی بولے:

"میرے بھائی! اگر یہ یاسر عرفات کی ریاست ہے تو پھر اسرائیلی فوج اِدھر کیا کر رہی ہے۔ ملکی کنٹرول ان کے پاس ہے۔ ویزے وہ جاری کرتے ہیں، پولیس اور فوج ان کی ہے۔ عدالتیں اور دوسرے ادارے ان کے قبضے میں ہیں۔ ایسے میں فلسطین کی آزادی تو قوم کے ساتھ ایک مذاق ہے............مذاق!"

یہ کہتے کہتے محمد جیلانی نے ایک طرف اشارہ کیا کہ: "وہ دیکھو یہودی، فلسطینی مہاجروں کی زمینوں پر نوآبادیاں قائم کر رہے ہیں۔"

میں نے دیکھا کہ یہودیوں کے لئے تعمیر کا کام زور و شور سے جاری تھا۔ نئے مکان، سڑکیں، پارک بنائے جا رہے تھے۔ اور دوسری طرف فلسطینی عورتیں اور بچے سڑک کے کنارے کھڑے پھلوں کے ٹوکرے اٹھائے یہودیوں کو پھل فروخت کر رہے تھے۔ اقبال پھر یاد آئے:

بجھی عشق کی آگ اندھیر ہے
مسلماں نہیں راکھ کا ڈھیر ہے

سڑک سے ذرا پرے ایک پہاڑی پر بنے چرچ کی طرف اشارہ کر کے محمد جیلانی نے بتایا کہ یہ مقام حضرت الیاس علیہ السلام ہے۔ حال ہی میں یہاں سے دس ہزار فلسطینیوں کو بے دخل کر کے یہ علاقہ یہودیوں کے حوالے کیا گیا ہے۔

ہم جس علاقے سے گزر رہے ہیں یہ ویسٹ بنک میں شامل تھا۔ وہی ویسٹ بنک جس کے بارے میں یاسر عرفات کا دعویٰ ہے کہ یہ فلسطینی ریاست ہے۔ اگر ایسا ہے تو یہاں اسرائیلی فوج کیوں ہے؟ اسرائیلی فوج ہر گزرنے والے فلسطینی کو روک کر اُس کی تلاشی کیوں لے رہی ہے اور فلسطینیوں کے ورک پرمٹ چیک کر کے انہیں اپنے ہی علاقے میں داخل ہونے کی اجازت دینے سے انکار کیوں کر رہی ہے؟

ہم ویسٹ بنک کے اس علاقے میں پہنچے جس پر اسرائیل نے 1967ء میں قبضہ کر لیا اور فلسطینیوں کو علاقہ بدر کر کے روس، امریکہ اور دوسرے یورپی ممالک سے یہودیوں کو لا کر

یہاں آباد کیا تھا۔

ہم جس سڑک پر سفر کر رہے تھے۔ وہ حبرون سے ہوتی ہوئی غزا کی پٹی تک جاتی ہے۔ سڑک کے اردگرد کا علاقہ انتہائی خوبصورت ہے۔ حد نظر تک چھوٹی چھوٹی ٹیلے نما پہاڑیاں ہیں اور ان میں انگوروں، آلو بخارا، زیتون اور انجیر کے باغات ہیں۔ کبھی یہ باغات مسلمانوں کے تھے اب ان پر یہودیوں کا قبضہ ہے۔ مسلمان یہودیوں سے اپنے سابق باغات کے پھل خریدتے ہیں اور سڑک کے کنارے ٹوکریاں لگا کر فروخت کرتے ہیں۔

ایسے میں کیا یہ بات جائز نہیں کہ:

ہے خاک فلسطین پہ یہودی کا اگر حق
ہسپانیہ پہ حق نہیں کیوں اہل عرب کا؟

حضرت شعیب علیہ السلام

ہم حلبین نامی گاؤں سے گزرے۔ گائیڈ نے یہاں قریب کی ایک پہاڑی کا نام خیارہ بتایا۔ اُس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ وہاں حضرت شعیب علیہ السلام کا مزار ہے۔ ہم نے گاڑی میں بیٹھے بیٹھے ہی ہاتھ اٹھا کر دعا مانگی۔

محمد جیلانی نے بتایا کہ اس گاؤں پر بھی یہودیوں نے قبضہ کیا ہوا ہے اور ان کے کھیتوں میں عرب کسان ہل چلاتے اور مزدوری کرتے ہیں۔ اس علاقے کو سلطان صلاح الدین ایوبی نے 1191ء میں فتح کیا تھا۔ ہم اس طرح کی کئی چھوٹی چھوٹی پہاڑیوں، سرسبز اور شاداب باغات کو دیکھتے ہوئے الخلیل یا حبرون کے شہر میں پہنچے۔

حبرون یا الخلیل

حبرون یروشلم سے 36 کلومیٹر دور ہے۔ آبادی 1,20,000 افراد پر مشتمل ہے۔ قیاس کیا جاتا ہے کہ یہ شہر چھ ہزار سالہ پرانا ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام جب عراق سے ہجرت کر کے فلسطین آئے تھے۔ تو انہوں نے اسی شہر کو اپنا مستقل مسکن بنایا تھا اور پھر حبرون کو اپنا مرکز بنا کر ایک طرف عرب کے صحرا میں اپنے بیٹے حضرت اسماعیلؑ کو آباد کیا تھا، دوسرے بیٹے حضرت اسحٰق علیہ السلام کو یہاں فلسطین میں۔ اپنے بھتیجے حضرت لوط علیہ السلام کو بحیرہ

مردار کے اردگرد کے علاقوں کی ذمہ داری سونپی تھی۔

حبرون الخلیل کے نام سے بھی جانا جاتا ہے۔ پتہ چلتا ہے کہ اس کی مناسبت حضرت ابراہیم علیہ السلام سے ہے' اُن کا لقب خلیل اللہ تھا۔ خلیل اللہ اور ان کے خاندان کے مقبرے اسی شہر کی ایک غار میں ہیں۔

ہم صبح دس بجے شہر میں داخل ہوئے تو شہر میں تین مختلف مقامات پر ہماری گاڑی کھڑی کر کے اسرائیلی فوج نے کاغذات چیک کیے اور مکمل تسلی کرنے کے بعد جانے کی اجازت دی۔

ان چیک پوسٹوں پر نہ صرف سیاحوں یا زیارت کرنے والوں کو چیک کیا جاتا ہے بلکہ مقامی مسلمان باشندوں کی بھی جامہ تلاشی لی جاتی ہے۔

الخلیل کا شہر پہاڑیوں کے دامن میں ہے۔ چاروں طرف پہاڑیاں ہیں جن پر کسی زمانے میں چار قبیلے رہتے تھے۔ بعد میں ان چاروں نے مل کر اس شہر کی حفاظت کی ذمہ داری لی اور اسے ایک مشترکہ شہر قرار دیا۔ شہر کی آبادی بڑھتے بڑھتے اب قریبی پہاڑیوں پر بھی پھیل گئی ہے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام

ہماری گاڑی پرانے شہر کے اس حصہ میں جا کھڑی ہوئی جہاں قریب ہی ایک پہاڑی کے دامن میں وہ غار ہے جہاں حضرت ابراہیم علیہ السلام کا خاندان ابدی آرام فرما رہا ہے۔ ہم گاڑی سے اُتر کر پیدل چلتے ہوئے اس غار کے دامن تک پہنچے جس پر اب ایک بڑی عمارت تعمیر ہے۔ اس عمارت کے اندر ہی ان جلیل القدر پیغمبروں کے مزار اور مسجد ہے۔

جب ہم عمارت کے مین گیٹ پر پہنچے تو اسرائیلی فوجیوں نے ہماری جامہ تلاشی لی۔ ہمارے بیگ، کیمرہ ہر چیز کو مشین سے گزار کر تسلی کی اور پھر بائیں طرف کے راستے سے ہمیں اندر جانے کا اشارہ کیا۔ ہم سیڑھیاں چڑھ کر اوپر والی منزل پر پہنچے تو وہاں دوبارہ اسرائیلی فوجیوں نے تلاشی لی یوں متعدد تلاشیوں کے بعد عمارت کے اس حصہ میں جانے کی اجازت ملی جس میں حضرت ابراہیم علیہ السلام، حضرت سارہ ؑ، حضرت اسحٰق علیہ السلام اور

عمارت میں داخل ہوتے ہی سب سے پہلے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی زوجہ حضرت سارہؑ کی قبر ہے باہر جالی ہے۔قبر تقریباً آٹھ فٹ اونچی ہوگی۔اس پر سبز رنگ کا ایک بوسیدہ غلاف ہے۔ہم نے یہاں فاتحہ پڑھی اور بائیں ہاتھ مڑ کر مسجد میں داخل ہوئے۔مسجد کے اندر سامنے دو قبریں ہیں ایک حضرت اسحٰق علیہ السلام کی اور اس کے سامنے انکی بیگم حضرت رفقہ علیہا کی جو حضرت یعقوب علیہ السلام کی والدہ تھیں۔ان قبروں کے باہر جالی ہے اور مسجد کے اندر یہ چھوٹے چھوٹے مزار بنے ہوئے ہیں۔یہ مقبرے تقریباً تین گز چوڑے اور آٹھ گز لمبے ہونگے۔دونوں قبریں ایک دوسرے کے سامنے ہیں۔مزاروں کے ساتھ ہی ایک علیحدہ کمرہ میں حضرت ابراہیم علیہ السلام خلیل اللہ کی قبر ہے۔جو زمین سے آٹھ فٹ اونچی ہے۔قبر پر سبز رنگ کا بوسیدہ غلاف ہے۔پتہ چلتا تھا کہ عرصہ دراز سے کسی نے نہ تو اندر جا کر صفائی کی اور نہ غلاف تبدیل کیا۔اندر قدرے اندھیرا تھا۔فرش پر کارپٹ بھی معمولی تھا۔اس جلیل القدر پیغمبر اور اللہ کے خلیل کا مزار اس حالت میں دیکھ کر بڑا دکھ ہوا۔

میں اس جلیل القدر پیغمبر کے دربار میں تھا۔جسے نمرود نے آگ میں پھینکا تو اللہ نے اپنے خلیل کے لئے آگ کو حکم دیا کہ اے آگ! میرے خلیل، میرے دوست کے لئے ٹھنڈی ہو جا۔لیکن اس قدر ٹھنڈا بھی نہ ہونا کہ میرے دوست کو سردی لگے۔

مقام افسوس ہے کہ جس برگزیدہ پیغمبر کیلئے آگ نے اپنی فطرت بدل لی تھی آج اسی پیغمبر کے لئے یہودی اپنی فطرت بدلنے کیلئے تیار نہیں۔

میری ملاقات مسجد کے امام صاحب سے بھی ہوئی۔جو یہودیوں کے رویے سے سخت نالاں تھے۔انہوں نے بتایا کہ کچھ سال پہلے یہودیوں نے نماز فجر کے وقت مسجد میں گھس کر 29 نمازیوں کو شہید کر دیا تھا۔

آہ!

ع "ہو گیا مانند آب ارزاں مسلماں کا لہو"۔

ہم وہاں سے عمارت کے اس حصہ میں جانے لگے جہاں حضرت یعقوب علیہ السلام دفن ہیں تو یہودیوں نے ہمیں مسلمان ہونے کی وجہ سے اُدھر جانے سے روک دیا۔

یہودی حضرت یعقوب علیہ السلام کو اپنا پیغمبر مانتے ہیں۔ حضرت یعقوب علیہ السلام کا نام اسرائیل تھا۔ اس لئے قرآن پاک میں اس قوم کو بنی اسرائیل کے نام سے مخاطب کیا گیا ہے۔ اب انہوں نے ہی مزار پر قبضہ کیا ہوا ہے۔

مسجد سے باہر نکلے تو غریب فلسطینیوں نے گھیر لیا۔ یہ لوگ مسجد سے باہر دور بیٹھے تسبیح، نماز کے مصلے اور ڈیکوریشن کیلئے بہت سی چیزیں فروخت کر رہے تھے۔ ہم نے کچھ تحائف خریدے۔

مسجد سے ہماری واپسی دوسرے راستے سے ہوئی۔ یہ راستہ تنگ اور تاریک تھا جو قدیم گلیوں میں سے گزرتا رہا۔ راستے میں مسلمانوں کے مکان کچے اور خستہ حالت میں دیکھے۔ جگہ جگہ کوڑا کرکٹ کے ڈھیر تھے۔ علاقہ میں سخت غربت تھی۔ کچھ نیم برہنہ بچے کھیل رہے تھے۔ انہوں نے ہمیں دیکھا تو ہمارے اردگرد جمع ہو گئے۔ میں نے کیمرہ نکالا اور ان کے فوٹو لیے۔

ہم نے الخلیل میں ایک گھنٹہ قیام کیا۔

واپسی پر گاڑی سیدھے رخ اوپر پہاڑی پر چڑھ کر واپس بیت المقدس کی طرف مڑ گئی۔ موسم انتہائی خوشگوار تھا۔ میں نے صبح اپنی وہ لیدر جیکٹ پہن لی تھی جسے بغداد سے خریدا تھا لیکن اب جوں ہی الخلیل سے نکلے تو گرمی نے اپنے جوہر دکھائے۔ میں نے جیکٹ اتار لی اور باقی سفر بغیر جیکٹ کے طے کیا۔

زیتون، انگور اور آلو بخارا کے باغات میں سے گزرتے ہوئے ہم بارہ بجے کے قریب الحلحول کے گاؤں میں پہنچے۔ یہاں مین روڈ پر ایک گفٹ شاپ کے سامنے گاڑی کھڑی ہوئی تو سب نے نکل کر شاپنگ کی۔ سب شاپنگ میں مصروف تھے تو میں زیتون کے ایک قریبی باغ میں چلا گیا۔ مجھے زیتون کے باغات دیکھنے کی شدید خواہش تھی چونکہ جس درخت کا ذکر قرآن پاک میں ہو اُسے موقع میسر ہونے کے باوجود نہ دیکھنا بدقسمتی تھی۔ چنانچہ باغ میں جا کر میں نے زیتون کی ایک ٹہنی اور چند پھل اتار کر تبرک کے طور پر پاس رکھ لیے۔

حضرت یونس علیہ السلام کا روضہ

شاپنگ کے بعد گاڑی چلی تو کچھ فاصلے کے بعد مین روڈ سے دائیں مڑ کر ایک مسجد کے سامنے آ کر رک گئی۔ روایت ہے کہ حضرت یونس علیہ السلام نبی اللہ یہاں مسجد کے اندر دفن ہیں۔ ہم نے مسجد کے اندر قبر بھی دیکھی اور دعا مانگی۔ قبر پر سبز چادر کا غلاف تھا۔ مسجد میں کسی نے تازہ تازہ سفیدی کی تھی جس کے نشانات قبر پر ڈالی ہوئی سبز چادر پر بھی نظر آئے۔

حضرت یونس علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے مچھلی والے کے نام سے بھی پکارا ہے۔ اس سے مراد وہ واقعہ ہے جب انہیں مچھلی نے نگل لیا تھا اور چالیس دن کے بعد اللہ کے حکم سے انہیں صحیح سلامت باہر پھینک دیا تھا۔ مچھلی کے پیٹ میں رہ کر حضرت یونس علیہ السلام اللہ تعالیٰ سے معافی مانگتے رہے تھے۔

لا الہ الا انت سبحنک انی کنت من الظلمین

(پاک ہے تیری ذات بے شک میں نے قصور کیا ـــــ سورہ الانبیاء)

حضرت یونس علیہ السلام کی قبر کے بارے میں بھی مختلف روایات ہیں۔ ایک روایت ہے کہ ان کی قبر عراق میں دریائے دجلہ کے کنارے بغداد سے جانب مشرق ہے۔

ہم نے نماز ظہر اسی مسجد میں ادا کی۔ نماز کے بعد میں نے ارد گرد کا جائزہ لیا تو پتہ چلا کہ یہ مقام ایک اونچی پہاڑی پر ہے۔ موسم خوشگوار تھا اور دور دور تک ہر چیز واضح نظر آ رہی تھی۔ پہاڑی کی ڈھلوان پر زیتون اور دوسرے پھل دار درختوں کے باغات تھے۔

اس گاؤں میں اقوام متحدہ نے فلسطینی مہاجر بچوں کے لئے سکول قائم کیا ہوا ہے۔ ہمیں دیکھ کر کچھ بچے ہمارے پاس آئے۔ گاؤں کے قریب ہی وہ غار ہے جس میں حضرت یحییٰ علیہ السلام کی پیدائش ہوئی تھی۔

بیت اللحم

حضرت یحییٰ علیہ السلام جس غار میں پیدا ہوئے ہم وہاں سے گزر کر اس غار کی طرف گئے جس میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش ہوئی تھی۔

عیسائی عالموں کا دعویٰ ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش بیت المقدس سے

دس کلو میٹر دور جانب جنوب بیت اللحم نامی قصبے میں ہوئی تھی۔ یہ قصبہ ایک اونچی پہاڑی پر آباد ہے اس کی آبادی 22,000 افراد پر مشتمل ہے۔ ان میں نصف مسلمان اور نصف عیسائی ہیں۔ قصبہ سرسبز اور زرخیز ہے اور کھیتوں میں گھرا ہوا ہے۔ یہاں انگور، زیتون کے درختوں کے علاوہ مٹر کے کھیت ہیں۔ قریب ہی بھیڑوں کی چراگاہ ہے جو عیسائی عقیدہ کے مطابق ایک مقدس جگہ ہے۔

جب ہم اس مقام پر پہنچے تو گاڑی قصبے میں داخل ہوتے ہی ایک جگہ پارک کر دی گئی۔ پورے قصبے کو گاڑیوں کی آمد و رفت کے لئے بند کر دیا گیا تھا۔ میں نے اپنے گائیڈ سے وجہ پوچھی تو اس نے بتایا کہ قصبے کو اکیسویں صدی کے لئے تیار کیا جا رہا ہے تمام سڑکوں، گلیوں اور تاریخی عمارتوں کو جدید بنایا جا رہا ہے۔

گاڑی سے اتر کر ہم سب اس مقام کی طرف چل پڑے جہاں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش ہوئی تھی۔ یہ مقام عیسائیوں کے لئے اتنا ہی مقدس ہے جتنا مسلمانوں کے لئے بیت اللہ۔

ہم پیدل چلتے ہوئے ایک پہاڑی پر چڑھتے گئے۔ اوپر گئے تو سامنے ایک عالی شان مسجد نظر آئی۔ یہ مسجد عمرؓ تھی۔ یہ وہی مقام ہے جہاں حضرت عمر ابن خطابؓ نے نماز ادا کی تھی۔ روایت ہے کہ جب حضرت عمرؓ ابن خطابؓ اس شہر میں فاتح کی حیثیت سے داخل ہوئے تو عیسائی عالموں نے انہیں شہر کی سیر کروائی۔ حضرت عمر خطابؓ جب اس مقام پر پہنچے تو نماز کا وقت ہو گیا۔ آپ نے نماز پڑھنے کا ارادہ ظاہر کیا تو عیسائی عالموں نے حضرت عمرؓ سے کہا کہ آپ ہمارے چرچ میں نماز ادا کر سکتے ہیں۔ حضرت عمرؓ نے جواب دیا: ''اگر میں نے یہاں نماز پڑھ لی تو ممکن ہے کل مسلمان اس چرچ کو مسجد بنا دیں۔'' چنانچہ عمر ابن خطابؓ نے چرچ کے باہر جانب جنوب ذرا ہٹ کر ایک کھلی جگہ میں نماز ادا کی۔ جہاں 1193ء میں سلطان صلاح الدین ایوبی کے بیٹے افضل (افدل) نے مسجد بنائی اور اس کا نام مسجد عمرؓ رکھا۔

ہم مسجد عمرؓ سے ہوتے ہوئے ایک کھلے صحن سے گزر کر ایک چرچ میں داخل ہوئے۔ چرچ میں داخل ہونے کے تین دروازے تھے لیکن پادریوں نے دو دروازے اینٹیں

لگا کر بند کر کے ایک چھوٹا 120 سینٹی میٹر اونچا دروازہ کھلا چھوڑا ہے۔ میرے خیال میں دروازہ چھوٹا اس لئے رکھا گیا ہے تاکہ لوگ جھک کر چرچ میں داخل ہوں۔ دنیا کا یہ پہلا چرچ چوتھی صدی عیسوی میں رومیوں نے بنایا تھا۔ چرچ کے تہہ خانے میں ایک غار ہے جہاں چرچ تعمیر ہونے سے قبل ایڈونس دیوتا کی عبادت کی جاتی تھی اور اسے اس دیوتا کی جائے پیدائش قرار دیا جاتا تھا۔ لیکن چوتھی صدی عیسوی میں عیسائی عالموں نے اس غار کو حضرت عیسٰی علیہ السلام کی جائے پیدائش قرار دیا۔

حضرت عیسٰی علیہ السلام کی تاریخ پیدائش میں بھی اختلاف ہے۔ کیتھولک اور مغربی چرچ اسے 25 دسمبر قرار دیتے ہیں۔ آرمینیا کے چرچ جو مشرقی کیلنڈر استعمال کرتے ہیں 16 جنوری کو حضرت عیسٰی علیہ السلام کا یوم پیدائش مناتے ہیں جبکہ یونانی آرتھوڈکس یوم پیدائش 7 جنوری کو قرار دیتے ہیں۔

چرچ یورپ اور دنیا کے کونے کونے سے آنے والے عیسائی زائرین سے بھرا ہوا تھا۔ ہم نے چرچ کو گھوم پھر کر دیکھا۔ یہ اعلٰی نقش و نگار سے مزین تھا۔ ہم ایک تنگ راستے سے چرچ کے تہہ خانے میں بھی اترے وہاں وہ غار ہے جہاں حضرت مریم نے بچے کی پیدائش کے سلسلہ میں ایک کھجور کے درخت کے نیچے پناہ لی تھی۔

حضرت مریمؑ اسی کھجور کے درخت سے کھجوریں کھا کر اور پانی پی کر گزارہ کرتی رہی تھیں۔ اسی مقام پر حضرت عیسٰی علیہ السلام نے جنم لیا تھا۔ جس مقام پر حضرت عیسٰی علیہ السلام پیدا ہوئے وہاں ایک ستارے کا نشان لگا کر اس بات کی نشاندہی کر دی گئی ہے تاکہ لوگوں کو پیدائش کے اصل مقام کا پتہ چلتا رہے۔ اس ستارے کے قریب دو موم بتیاں جلتی رہتی ہیں۔ فرش سنگ مرمر کا ہے۔ غار میں داخل ہونے کے لئے ایک طرف سے نیچے سیڑھیاں اترنی پڑتی ہیں جبکہ باہر نکلنے کے لئے دوسری طرف سیڑھیاں اوپر چڑھتی ہیں۔ ہم نے اس جگہ ایک فوٹو لیا۔

بیت اللحم کا عربی میں مطلب ''گوشت کا گھر'' اور عبرانی میں مطلب ''روٹی کا گھر'' ہے۔ اس قصبہ میں مجھے زیادہ تر لکڑی کے وہ کاریگر نظر آئے جو زیتون کی لکڑی سے زائرین کے لئے مذہبی اشیاء تیار کرتے ہیں۔ میں نے سنا کہ یہاں کے کاریگر پتھر کی دیواریں تیار

کرنے کے لئے مشہور ہیں۔ لوگوں کی آمدن کا انحصار زائرین پر ہے۔

یہ قصبہ بیت المقدس سے دس کلو میٹر دور ہے۔ حضرت مریمؑ جو ایک زاہدہ، نیک، پرہیز گار اور اللہ کی نیک بندی تھیں مسجد اقصیٰ کے قریب ہی ایک محلہ میں پیدا ہوئی تھیں۔ بیت المقدس میں وہ حضرت زکریا علیہ السلام کی نگرانی میں زیر تربیت رہیں۔ حضرت مریمؑ حرم شریف کے مشرقی حصہ میں پردہ کر کے اعتکاف میں بیٹھی تھیں جب اللہ کا فرشتہ آیا اور حضرت مریمؑ کو بیٹے کی بشارت دی تو حضرت مریمؑ گھبرا گئیں۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش کی مکمل تفصیل قرآن پاک میں سورہ مریم کی آیت 16 میں موجود ہے۔ متعلقہ آیات کا ترجمہ درج ذیل ہے:

''اور اے محمد صلی اللہ وعلیہ سلم اس کتاب میں مریمؑ کا حال بیان کرو، جبکہ وہ اپنے لوگوں سے الگ ہو کر شرقی جانب گوشہ نشین ہو گئی تھی اور پردہ ڈال کر ان سے چھپ بیٹھی تھی۔ اس حالت میں ہم نے اس کے پاس اپنی روح کو (یعنی فرشتے کو) بھیجا اور وہ اس کے سامنے ایک پورے انسان کی شکل میں نمودار ہو گیا۔

مریمؑ یکایک بول اٹھی کہ ''اگر تو کوئی خدا ترس آدمی ہے تو میں تجھ سے پناہ مانگتی ہوں'' اس نے کہا ''میں تو تیرے رب کا فرستادہ ہوں اور اس لئے بھیجا گیا ہوں کہ تجھے ایک پاکیزہ لڑکا دوں۔''

مریمؑ نے کہا ''میرے ہاں کیسے لڑکا ہو گا جبکہ مجھے کسی بشر نے چھوا تک نہیں ہے اور میں کوئی بدکار عورت نہیں ہوں۔''

فرشتے نے کہا'' ایسا ہی ہو گا، تیرا رب فرماتا ہے کہ ایسا کرنا میرے لیے بہت آسان ہے۔ اور ہم یہ اس لیے کریں گے کہ اس لڑکے کو لوگوں کے لیے ایک نشانی بنائیں اور اپنی طرف سے ایک رحمت۔ اور یہ کام ہو کر رہنا ہے۔

مریمؑ کو اس بچے کا حمل رہ گیا اور وہ اس حمل کو لیے ہوئے ایک دور کے مقام پر چلی گئی۔ پھر زچگی کی تکلیف نے اسے ایک کھجور کے

درخت کے نیچے پہنچا دیا۔ وہ کہنے لگی" کاش میں اس سے پہلے ہی مرجاتی اور میرا نام ونشان نہ رہتا۔" فرشتے نے پائنتی سے اس کو پکار کر کہا" غم نہ کر۔ تیرے رب نے تیرے نیچے ایک چشمہ رواں کر دیا ہے۔ اور تو ذرا اس درخت کے تنے کو ہلا، تیرے اوپر تر و تازہ کھجوریں ٹپک پڑیں گی۔ پس تو کھا اور اپنی آنکھیں ٹھنڈی کر۔ پھر اگر کوئی آدمی تجھے نظر آئے تو اس سے کہہ دے کہ میں نے رحمان کے لیے روزے کی نذر مانی ہے۔ اس لیے آج میں کسی سے نہ بولوں گی۔"

پھر وہ اس بچے کو لیے اپنی قوم میں آئی۔ لوگ کہنے لگے" اے مریم یہ تو، تو نے بڑا پاپ کر ڈالا۔ اے ہارون کی بہن نہ تو تیرا باپ کوئی برا آدمی تھا اور نہ تیری ماں ہی کوئی بدکار عورت تھی۔"

مریمؑ نے بچے کی طرف اشارہ کر دیا۔

لوگوں نے کہا" ہم اس سے کیا بات کریں جو گہوارے میں پڑا ہوا ایک بچہ ہے"

بچہ بول اٹھا" میں اللہ کا بندہ ہوں۔ اس نے مجھے کتاب دی اور نبی بنایا اور بابرکت کیا۔ جہاں بھی میں رہوں اور نماز اور زکوٰۃ کی پابندی کا حکم دیا جب تک میں زندہ رہوں اور اپنی والدہ کا حق ادا کرنے والا بنایا اور مجھ کو جبار اور شقی نہیں بنایا۔ سلام ہے مجھ پر جبکہ میں پیدا ہوا اور جبکہ میں مروں اور جبکہ زندہ کر کے اٹھایا جاؤں۔

یہ ہے عیسیٰؑ ابن مریمؑ اور یہ ہے اس کے بارے میں وہ سچی بات جس میں لوگ شک کر رہے ہیں۔ اللہ کا یہ کام نہیں ہے کہ وہ کسی کو بیٹا بنائے۔ وہ پاک ذات ہے وہ جب کسی بات کا فیصلہ کرتا ہے تو کہتا ہے ہو جا اور وہ ہو جاتی ہے۔"

بیت اللحم کے بیرونی صحن سے گزر کر ہم مسجد عمر ابن خطابؓ کے پاس سے نیچے اُترے اور ڈھلوان پر پیدل چلتے ہوئے دوبارہ گاڑی میں جا بیٹھے۔

دن کے دو بج چکے تھے۔ گائیڈ نے خوش خبری سنائی کہ ہمیں کنگ ڈیوڈ ہوٹل سے دوپہر کا کھانا کھلایا جائے گا۔ چنانچہ گاڑی وہاں سے چلی اور ذرا دیر بعد ایک اور اونچی پہاڑی پر ہوٹل کنگ ڈیوڈ کے قریب جا کر رک گئی۔

دوپہر کا کھانا کنگ ڈیوڈ ہوٹل میں کھایا۔ کھانا کھا کر میں نے ہوٹل کے باہر کھڑے ہو کر علاقہ کا جائزہ لیا۔ جس جگہ میں کھڑا تھا یہ بھی ویسٹ بنک میں شامل تھا۔ مجھے اکیلے کھڑے دیکھ کر تصویریں فروخت کرنے والے بچے آ گئے۔ ایک تصویر کے انہوں نے تین ڈالر مانگے۔ یہ تصویر صبح میں ہوٹل سے پانچ ڈالر میں خرید چکا تھا۔ میں نے کہا تین ڈالر نہیں بلکہ پانچ ڈالر کی دو تصویریں دو۔ لڑکے نے خوشی خوشی دے دیں۔

کھانا کھا کر ہمارے ساتھی باہر نکلے تو حاجی رشید نے پانچ ڈالر میں پانچ تصویریں خریدیں اور حاجی شاہ پال نے پانچ ڈالر میں سات۔ نجانے تصویر کی اصل قیمت کیا ہو گی؟

سیاحوں کو لوٹنے کے لئے کیا کچھ نہیں کیا جاتا!

مزار پر کھڑے ہو کر دیکھا تو نیچے اسرائیل کا علاقہ دور دور تک نظر آیا۔ اس میں بیت المقدس کا مغربی کنارا اور شہر بھی شامل تھا۔ اسرائیلی سٹیٹ بنک، سپریم کورٹ، ہائی یونیورسٹی، اسرائیلی میوزیم، وزارت مالیات، وزارت داخلہ، وزارت خارجہ، پرائم منسٹر ہاؤس اور پارلیمنٹ ہاؤس (The Knesset) کی عمارتیں جیسے پاؤں میں نظر آئیں۔ یہاں کھڑے ہو کر مجھے پتہ چلا کہ جس ہوٹل میں ہمارا قیام ہے وہ بھی اسی علاقہ میں واقع ہے۔

حضرت داؤد علیہ السلام

کھانے کے بعد ہم حضرت داؤد علیہ السلام کے روضہ پر حاضر ہوئے۔ روضہ پرانے شہر کے ایک اونچے مقام پر واقع ہے۔ اس کے ساتھ حضرت داؤد علیہ السلام سے متعلقہ میوزیم بھی ہے۔ مسلمان حضرت داؤد علیہ السلام کو پیغمبر اور یہودی انہیں بادشاہ تسلیم کرتے ہیں یہی وجہ ہے کہ ہم حضرت داؤد علیہ السلام اور یہودی انہیں کنگ ڈیوڈ کہتے ہیں۔

میں حضرت داؤد علیہ السلام کے روضہ میں داخل ہوا تو ایک یہودی دوڑتا ہوا آیا اور مجھے ایک ٹوپی دی کہ ننگے سر روضہ پر حاضری نہ دیں۔ میں نے جوتے پہنے ہوئے تھے جب

جوتوں کی طرف اشارہ کیا تو اس نے کہا کہ جوتے بے شک نہ اُتاریں۔

یہ بات مجھے عجیب محسوس ہوئی کہ عزت و احترام میں سر ڈھانپ لو لیکن جوتے نہ اُتارو۔ چنانچہ میں نے سر ڈھانپ لیا اور جوتے پہنے ہوئے حضرت داؤد علیہ السلام کے مزار پر دعا کی۔

مزار پر دو رنگ کی چادریں تھیں۔ نیچے سبز اور اوپر کلیجی رنگ کی۔ قبر کے اوپر تیل ڈالنے والے دو بڑے بڑے کپے رکھے ہوئے تھے۔ قبر کی لمبائی اور چوڑائی عام قبروں جیسی تھی۔ قبر کے ایک طرف دیوار تھی۔ زائرین اس کے ایک طرف کھڑے ہو کر دعا مانگتے ہیں۔ قبر کے اوپر سرہانے کی طرف تاج رکھا ہوا تھا۔

مزار کی زیارت کرتے وقت مجھے یاد آیا حضرت داؤد علیہ السلام اللہ کے برگزیدہ پیغمبر تھے جن پر اللہ تعالیٰ نے زبور کتاب اُتاری تھی۔ کتاب کے ساتھ ساتھ اللہ تعالیٰ نے انہیں دو صفتیں عطا کیں تھیں۔

پہلی صفت یہ کہ حضرت داؤد علیہ السلام خوش الحان تھے جب وہ اللہ کی حمد و ثناء ترنم سے کرتے تو پرندے رک جاتے تھے۔ آج بھی ہم خوش الحان لوگوں کے بارے میں کہتے ہیں کہ فلاں نے ''لحن داؤدی'' پایا ہے۔ حضرت داؤد علیہ السلام نے وادی زیتون میں اپنا محل تعمیر کیا اور وہاں زیتون کے باغات لگوائے۔ ان باغات کی مناسبت سے آج بھی یہ پہاڑی جبل زیتون کے نام سے پکاری جاتی ہے۔

دوسری صفت جو عطا ہوئی تھی وہ لوہے کا استعمال تھا۔ حضرت داؤد علیہ السلام سے قبل دنیا میں لوہے کا استعمال نہیں ہوتا تھا۔ اگر تھا بھی تو معمولی۔ چنانچہ اللہ نے انہیں وہ حکمت عطا کی جس سے انہوں نے لوہے سے ساز و سامان اور استعمال کی دوسری اشیاء تیار کرنی شروع کی تھیں۔ قرآن پاک میں سورہ سبا میں ارشاد خداوندی ہے:

''اور ہم نے لوہے کو اس کے لئے نرم کر دیا (اور اس کو ہدایت کی) کہ پوری زرہیں بنا اور ٹھیک اندازے سے کڑیاں جوڑ''

حضرت داؤد علیہ السلام ابھی کم عمر تھے کہ طالوت کی فوج میں شامل ہو کر جالوت سے ہونے والی لڑائی میں شامل ہوئے۔ میدان جنگ میں جالوت' جو ایک جری پہلوان تھا' کو

حضرت داؤد علیہ السلام نے ہی قتل کیا تھا۔ اس کے بعد طالوت نے اپنی بیٹی کا رشتہ حضرت داؤد علیہ السلام کو دیا اور انہیں اپنا جانشین بنا دیا۔

یہ حضرت داؤد علیہ السلام ہی تھے جن کے سامنے دو آدمیوں نے اپنا مقدمہ پیش کیا۔ ایک کے پاس ایک دنبی تھی اور دوسرے کے پاس 99 دنبیاں تھیں۔ 99 والا دوسرے سے اس کی ایک دنبی چھیننا چاہتا تھا۔ حضرت داؤد علیہ السلام نے 99 دنبیوں والے کو برا بھلا کہا۔ لیکن پھر انہیں خیال آیا کہ ممکن ہے اللہ نے میرے امتحان کے لئے ان کو بھیجا ہو۔ تب حضرت داؤد علیہ السلام نے اللہ سے رجوع کیا اور توبہ کی۔

یہودی اور عیسائی دنبیوں والے اس واقعہ کو حضرت داؤد کی 99 بیویوں کی طرف اشارہ بتاتے ہیں کہ 99 بیویاں ہونے کے باوجود انہوں نے اپنے ایک افسر ساریہ نامی کو اس لئے میدان جنگ میں بھیجا تاکہ وہ شہید ہو اور اس کی بیگم سے نکاح کیا جائے۔ یہ بات قرآن سے ثابت نہیں ہے۔

حضرت داؤد علیہ السلام کے مزار کی دوسری منزل پر وہ کمرہ ہے جس کے بارے میں عیسائیوں کا دعویٰ ہے کہ یہاں حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اپنے پیروکاروں کے ساتھ زندگی کا آخری کھانا کھایا تھا۔

حضرت داؤد علیہ السلام کا مزار بیت المقدس شہر کی اس دیوار کے بیچ میں واقع ہے جو شہر کی حفاظت کے لئے عثمانیوں نے تعمیر کی تھی۔ طرز تعمیر سے پتہ چلتا ہے کہ حضرت داؤد علیہ السلام کا مزار بھی عثمانیوں نے تعمیر کیا تھا۔ اگر یہ بات سچ ہے تو پھر عیسائیوں کا حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا آخری کھانا کھانے والی بات مہمل نظر آتی ہے۔ مزار سے چلے تو تھوڑا فاصلہ طے کرنے کے بعد ہم مسجد اقصیٰ جا پہنچے۔

بیت المقدس کا پرانا شہر

بیت المقدس کے پرانے شہر کے اردگرد اب تک وہی دیوار موجود ہے جو ترکوں نے بنوائی تھی۔

شہر میں داخل ہونے کے لئے سات دروازے ہیں۔ باب المامور سب سے بڑا

anjumhasnain2008@yahoo.com

دروازہ (مین گیٹ) ہے۔ شہر چار حصوں میں تقسیم ہے۔ ایک حصہ میں مسلمان، دوسرے میں عیسائی، تیسرے میں یہودی اور چوتھے میں آرمینیا کے لوگ رہتے ہیں۔ سب سے بڑا حصہ وہ ہے جہاں مسلمان رہتے ہیں۔ اسی حصہ میں مسجد اقصیٰ اور مسجد صخرہ واقع ہیں۔ جس حصہ میں مسلمان رہتے ہیں اسی طرف شہر کی دیوار کے باہر مسلمانوں کا قبرستان ہے۔ جہاں بہت سے صحابہ اور شہداء کی قبریں ہیں۔ قبرستان میں کھڑے ہو کر اگر آپ شہر کی طرف پشت کریں تو آپ کے سامنے جبل زیتون اور پاؤں میں وادی کیدرون ہے۔ حضرت مریمؑ کا مزار اسی وادی میں یہاں سے نظر آتا ہے۔

پرانا شہر دیوار کے اندر ایک قلعہ کی شکل میں ہے۔ جس طرح پاکستان میں جہلم کے قریب رہتاس کے قلعہ میں آبادی ہے۔ یا پھر شمالی انگلستان کا شہر یارک (York) جس کے گرد فصیل ہے اور جو چار دیواری کے اندر آباد ہے۔

ہم لائین گیٹ (Lion Gate) سے شہر میں داخل ہوئے تو سب سے پہلے مسلمانوں کے رہائشی مکان اور دکانیں دیکھیں۔

تنگ گلیوں سے گزر کر ہم بائیں ہاتھ مڑ کر ایک بڑے دروازے پر پہنچے۔ جس کے دائیں طرف وضو خانے تھے۔ سب نے وضو کیا اور مسجد کی طرف چل پڑے۔ مسجد کے اردگرد بہت کھلے لان تھے جن میں گھاس اور چھوٹے چھوٹے درخت اُگے تھے۔ لان سے گزر کر ہم اس اونچے مقام پر پہنچے جہاں مسجد صخرہ ہے۔ یہ مقام شہر میں سب سے اونچا ہے۔ آپ جس طرف سے بھی القدس آئیں مسجد صخرہ دور سے نظر آئے گی۔ آپ یہ تصور کر سکتے ہیں کہ مسجد ایک بڑے چبوترے پر واقع ہے جس کے چاروں طرف کھلے دالان ہیں۔

حرم شریف

بیت المقدس کے پرانے شہر میں جبلِ زیتون کی طرف چاردیواری کے اندر 1499 فٹ لمبا اور 595 فٹ چوڑا احاطہ حرم شریف کہلاتا ہے۔ حرم شریف کے اندر مسجد اقصیٰ، مسجد صخرہ اور مقام براق کے علاوہ حضرت سلیمان علیہ السلام کی قبر بھی ہے۔ بیت المقدس کا یہ متبرک ترین مقام ہے جہاں حضرت ابراہیم علیہ السلام سے لیکر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم

نے عبادت کی۔

مسجد صخرہ (Dome of Rock)

زندگی بھر جس مسجد کو میں مسجد اقصیٰ سمجھتا رہا اُسے وہاں جا کر دیکھا تو وہ مسجد صخرہ نکلی۔ یہ مسجد خلیفہ عبدالملک بن مروان نے 691ء میں تعمیر کروائی تھی۔ میں نے مسجد صخرہ کے صحن میں پہنچ کر اردگرد کا جائزہ لیا تو قریب ہی جانب جنوب مجھے مسجد اقصیٰ نظر آئی۔ وہی مسجد اقصیٰ جو ہمارا قبلہ اول ہے۔ مسجد الحرام اور مسجد نبوی کے بعد مسلمانوں کی سب سے محترم مسجد۔

مسجد پر نظر پڑی تو زبان پر قرآن پاک کی سورہ بنی اسرائیل کا ورد شروع ہو گیا:

سبحن الذی اسریٰ بعبده لیلا من المسجد الحرام

الی المسجد الا قصا الذی بر کنا حوله لنریه من

ایتنا انه هو السمیع البصیر O

(پاک ہے وہ جو لے گیا ایک رات اپنے بندے کو مسجد حرام سے دور اس مسجد تک جس کے ماحول کو اس نے برکت دی ہے۔ تا کہ اسے اپنی کچھ نشانیوں کا مشاہدہ کرائے۔ حقیقت میں وہی ہے۔ سب کچھ سننے اور دیکھنے والا۔)

اس وقت میرے لبوں پر قرآن پاک کی آیات تھیں اور آنکھوں کے سامنے مسجد اقصیٰ۔ ذہن میں وہ منظر گھوم رہا تھا جب حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم معراج پر روانہ ہونے سے قبل مسجد الحرام یعنی خانہ کعبہ سے یہاں مسجد اقصیٰ میں پہنچے تھے۔ اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابراہیم علیہ السلام سے لیکر دوسرے تمام انبیاء کرام کی نماز میں امامت فرمائی۔

عصر کا وقت قریب تھا۔ سورج کی شعاعیں مسجد اقصیٰ اور مسجد صخرہ سے منعکس ہو کر پورے علاقے کو منور کر رہی تھیں۔ فضا میں ایک نور سا بکھرا ہوا تھا۔ پرندے فضا میں قلابازیاں لگا کر میٹھی آواز میں اللہ کی حمد و ثناء میں مصروف تھے کہ کان میں آواز آئی:

اللہ اکبر اللہ اکبر　　اللہ اکبر اللہ اکبر

اشھد ان لا الہ الا اللہ　　اشھد ان لا الہ الا اللہ

اشھد ان محمد رسول اللہ اشھد ان محمد رسول اللہ

حی علی الصلوۃ حی علی الصلوۃ حی علی الفلاح حی علی الفلاح

اللہ اکبر اللہ اکبر لا الہ الا اللہ

اذان ختم ہوئی تو میں اٹھ کر نماز عصر ادا کرنے مسجد کے اندر چلا گیا۔ نماز میں کوئی پچاس ساٹھ آدمی شامل تھے۔ نمازیوں کی اتنی کم تعداد دیکھ کر دکھ ہوا۔ نماز کے بعد گھوم پھر کر مسجد کا جائزہ لیا۔

مسجد کے عین درمیان میں ایک چٹان ہے جس کے اوپر گنبد ہے اسی وجہ سے یہ مسجد (Dome of Rock) یعنی چٹان کا گنبد بھی کہلاتی ہے۔ نماز کی ادائیگی کے بعد ہم مسجد کے اس تہہ خانے میں اترے جو ایک چٹان کی شکل میں ہے۔ سیڑھیاں اتر کر نیچے گئے تو دیکھا کہ وہاں بھی کارپٹ پڑا ہے۔ اندر تقریباً تیس آدمیوں کے نماز پڑھنے کی گنجائش تھی۔ غار تقریباً آٹھ فٹ اونچی ہوگی۔ فرش سے قدرے تین فٹ اونچے تین مصلے ہیں۔ جن میں سے ایک حضرت ابراہیم علیہ السلام، دوسرا حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور تیسرا حضرت داؤد علیہ السلام سے منسوب ہے۔

غار کے عین درمیان میں جگہ خالی ہے۔ گائیڈ بتا رہا تھا کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا معراج وہاں سے شروع ہوا اور یہیں سے وہ اوپر گئے۔ جس کی وجہ سے چٹان میں سوراخ ہو گیا تھا۔ میں غار کے اندرونی حصوں کا جائزہ لے رہا تھا کہ ہمارے ایک ساتھی حاجی غنی نے اپنے کھونڈے سے چٹان توڑنے کی کوشش شروع کر دی تاکہ چٹان کے ٹکڑوں کو تبرک کے طور پر اپنے ساتھ لے جائیں۔ زائرین نے منع کیا لیکن وہ باز نہ آئے اور اپنی کوشش جاری رکھی۔ پتھر توڑنے کی آواز جوں ہی باہر سیکورٹی سٹاف کو پہنچی، وہ دوڑتے ہوئے آئے۔ انہوں نے فوراً حاجی غنی کو دبوچ کر باہر نکال دیا۔

سیکورٹی افیسر سخت غصے میں تھا۔ اُس نے ہمیں بتایا کہ زمانہ جاہلیت میں عیسائی یہاں سے پتھر توڑ کر سونے کے بھاؤ فروخت کیا کرتے تھے۔ یہاں سے پتھر توڑنا کفر ہے۔ جاہلیت کی نشانی ہے۔ پھر سیکورٹی آفیسر نے ہمیں مسجد کے تاریخی پہلوؤں سے آگاہ کیا۔ جب میں نے اپنے سفر کا مقصد بیان کیا اور وہاں فوٹو لینے کی اجازت چاہی تو اس نے نہ صرف فوٹو

بنوانے کی اجازت دی بلکہ اسی تہہ خانے ہمارے ساتھ اپنی فوٹو بھی بنوائی جو اس کتاب میں شامل ہے۔

غار سے باہر نکل کر میں نے مسجد کا جائزہ لیا تو اوپر گنبد کے اندر انتہائی خوبصورت بیل بوٹے بنائے گئے تھے۔ خوبصورت فانوس جل رہے تھے۔ ہر طرف نور ہی نور تھا۔

مسجد سے باہر نکلے تو حاجی غنی اپنے کنبہ کے ساتھ ''کھونڈا'' لیے کھڑے تھے۔ ہمارے گائیڈ نے مجھ سے پوچھا کہ غار میں کیا واقعہ ہوا تھا۔ میں نے بتایا کہ حاجی صاحب تبرک کے طور پر پتھر توڑنے کی کوشش کر رہے تھے کہ سیکورٹی والے آ گئے جنہوں نے کہا کہ یہ جہالت ہے ایسا نہ کریں۔

جب میں نے ''جہالت'' کا لفظ استعمال کیا تو حاجی غنی جو پہلے ہی پتھروں کا تبرک نہ ملنے سے لال پیلے ہو رہے تھے مجھ پر برس پڑے۔

''میں جاہل نہیں ہوں۔ جاہل آپ لوگ ہیں۔'' اور غصہ میں لال پیلے یہودیوں کی دیوارِ گریہ کی طرف نعرے لگاتے چل پڑے۔ گائیڈ نے انہیں خاموش رہنے کے لئے کہا اور بتایا کہ گذشتہ ہفتے یہاں ہنگامہ ہوا تھا اور یہودیوں نے گولی چلائی تھی جس سے دس مسلمان شہید ہو گئے تھے۔

یہ سن کر حاجی غنی ٹھنڈے پڑ گئے۔

یہ ہنگامہ برپا تھا کہ میں دیوار کے قریب گیا اور اس جگہ کو دیکھا جو دیوارِ گریہ کہلاتی ہے۔ یہ دیوار یہودیوں کے عقیدہ کے مطابق انتہائی مقدس ہے۔ جس طرح مسلمان حج کے لئے مسجد الحرام جاتے ہیں یہودی اس مقام پر آتے، روتے اور فریادیں کرتے ہوئے اپنے گناہ معاف کرواتے ہیں۔

مسجد اقصیٰ کے پہلو میں مقامِ براق ہے۔ جس کے بارے میں روایت ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جب معراج پر تشریف لے گے تو جس براق پر وہ سوار تھے وہ یہاں باندھا تھا۔ یہ ایک گہری سی کنواں نما جگہ ہے۔ ایک لوہے کا کڑا ابھی لٹک رہا ہے جو اس بات کی نشاندہی کر رہا ہے کہ براق کو یہاں باندھا گیا تھا۔ اس سے ذرا آگے ترتیب میں کچھ حجرے نما کمرے تھے۔ جن میں نامور مسلمانوں کی قبریں ہیں۔ ان میں سے ایک حجرے میں

مولانا محمد علی جوہر کی قبر ہے۔ جس کے باہر ایک بورڈ نصب ہے: ''محمد علی الہندی''۔

جب میں مولانا محمد علی جوہر کے مزار پر حاضر ہوا تو میرے ذہن میں ان کا وہ تاریخی خطاب کروٹیں لینے لگا جب وہ اپنے بھائی مولانا شوکت علی جوہر اور اپنی بیگم کے ہمراہ پہلی گول میز کانفرنس میں شرکت کے لئے لندن تشریف لائے تھے۔ گول میز کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا تھا:

''میں غلام ملک میں لوٹ کر نہیں جاؤں گا۔ مجھے ایک غیر ملک میں جسے آزادی کا شرف حاصل ہے غربت کی موت منظور ہے۔ اگر مجھے ہندوستان کی آزادی نہیں دیں گے تو پھر یہاں میرے لئے ایک قبر کی جگہ دینی پڑے گی۔''

اس تقریر کے چند دن بعد 4 جنوری 1931ء کو صبح سوا نو بجے ہائیڈ پارک ہوٹل لندن میں، جہاں مولانا کا قیام تھا۔ انتقال کر گئے۔ میت دن بھر ہوٹل میں رہی۔ رات بارہ بجے ہوٹل کے پچھلے دروازے سے میت کو باہر نکالا گیا۔ 5 جنوری 1931ء کو شام چھ بجے لیڈنگٹن ہال میں نماز جنازہ ادا کی گئی۔ مولانا محمد علی جوہر کو لندن یا ہندوستان میں دفن کرنے کے بارے میں سوچ و وچار جاری تھا کہ فلسطین کے مفتی اعظم مفتی امین الحسینی نے جسدِ خاکی کو فلسطین لا کر مسجد اقصیٰ کے پہلو میں دفن کرنے کی پیش کش کی۔ جسے مولانا شوکت علی جوہر نے منظور کر لیا۔ میت کو بحری جہاز کے ذریعے بیت المقدس پہنچایا گیا جہاں جمعہ 23 جنوری 1931ء شام چار بجے سپردِ خاک کیا گیا۔

مولانا محمد علی جوہر کو بیت المقدس میں دفن کرنے کا اصل سبب یہ بنا کہ مسجد اقصیٰ کے پہلو میں ایک خالی حجرے میں مسجد اقصیٰ کا ایک عرب نسل مجاور مقیم تھا جسے یہ حجرہ وراثت میں ملا تھا۔ جب اس مجاور کو مولانا محمد علی جوہر کی وفات اور مسلمانوں کے لئے ان کے دل میں موجزن تڑپ اور آزادی کی جدوجہد کا علم ہوا تو انہوں نے وہ حجرہ محمد علی جوہر کی ابدی خواب گاہ کے لئے پیش کیا۔ مولانا محمد علی جوہر اسی حجرے میں ابدی آرام فرما رہے ہیں۔ جب تک وہ عرب مجاور زندہ رہا مولانا محمد علی جوہر کی قبر کا نگہبان بھی رہا۔ ان کے ساتھ والے حجرہ میں شریف حسین، شریفِ مکہ دفن ہیں۔

مسجد صخرہ سے اگر آپ قبلہ کی طرف منہ کر کے کھڑے ہوں تو سامنے قدرے نیچے

مسجد اقصیٰ ہے اور دائیں طرف دیوار گریہ، مقام براق، محمد علی جوہر کی قبر ہے۔
یہاں سے اُتر کر ہم مسجد اقصیٰ پہنچے۔

مسجد اقصیٰ

مسجد اقصیٰ خلیفہ عبدالملک بن مروان نے 705ء میں بنوانی شروع کی تھی۔ جو دس سال بعد 715ء میں خلیفہ مہدی کے دور میں مکمل ہوئی۔ مسجد اقصیٰ حرم شریف کے احاطے میں تعمیر ہوئی ہے۔ مورخین بتاتے ہیں کہ 638ء میں جب عمر ابن خطابؓ بیت المقدس تشریف لائے تو انہوں نے مقامی پادریوں کی قیادت میں پورے شہر کا دورہ کیا۔ حضرت عمرؓ نے انہیں کہا کہ مجھے مسجد داؤد علیہ السلام لے چلو۔ حضرت عمرؓ کو پادریوں نے مختلف مقامات دکھائے لیکن حضرت عمرؓ نے انہیں تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ جب آپ حرم شریف کے اس مقام پر پہنچے جہاں آج کل مسجد اقصیٰ ہے تو اسے دیکھ کر فرمایا: "یہ وہی جگہ ہے جس کا نقشہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں بتایا تھا۔"

حضرت عمر خطابؓ نے قریب جا کر دیکھا تو وہاں کوڑا کرکٹ کے ڈھیر تھے۔ حضرت عمرؓ نے اس مقام کو پاک صاف کرنے کا حکم دیا۔ روایت ہے کہ سب سے پہلے حضرت عمرؓ نے ہی اپنے کرتے کے دامن میں کوڑا کرکٹ بھرا اور دوسری جگہ جا کر پھینکا۔ پھر دیکھا دیکھی تمام مسلمانوں نے اس پر عمل کیا اور آخر کار وہ جگہ صاف ہوئی۔ اس کے بعد حضرت عمرؓ نے فرمایا اس جگہ کو پاک ہونے کے لئے تین بارشوں کا انتظار کرو۔

حضرت عمرؓ نے وہاں کنارے پر ایک پاک جگہ کا انتخاب کیا اور حضرت بلالؓ سے درخواست کی کہ وہ اذان دیں۔ حضرت بلالؓ نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے بعد اذان دینی بند کر دی تھی لیکن خلیفہ وقت کی درخواست پر اذان دی۔ اذان سن کر صحابہ کرامؓ کو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا دور یاد آ گیا۔ بہت سے صحابہ رو پڑے۔ بعد میں اسی مقام پر خلیفہ عبدالملک نے مسجد تعمیر کروائی تھی۔

ہیکلِ سلیمانی بھی حدودِ حرم میں تھا۔ جس کا 598 قبل مسیح میں بابل کے بادشاہ نے نام ونشان تک مٹا دیا تھا۔ پھر ہیکل میں رکھی ہوئی قیمتی اشیاء لے گیا۔ 522 قبل مسیح میں

دارا اول کے دور میں بابل کے اسیروں کو رہائی ملی تو حرم شریف میں حضرت زکریا علیہ السلام نبی اللہ اور سردار کاہن یشوع کی نگرانی میں ہیکل کو از سرِ نو تعمیر کیا گیا اور 175 قبل مسیح میں یونانی بادشاہ نے ہیکلِ سلیمانی میں زبردستی بت رکھوائے اور قربان گاہ کو بند کیا۔

70ء میں رومیوں نے طاقت کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس شہر پر قبضہ کیا تو ہیکلِ سلیمانی کو مسمار کر دیا جو پھر کبھی تعمیر نہ ہو سکا۔

اس واقعہ کے 625 سال بعد خلیفہ عبدالملک بن مروان نے 705ء میں مسجد اقصیٰ بنوائی۔ تاریخی کتب سے پتہ چلتا ہے کہ 625 سال کے درمیانی عرصہ میں یہاں کوئی عمارت نہیں تھی۔

ایک بات مسلمہ ہے کہ حرم شریف کا تمام علاقہ انتہائی مقدس ہے۔ انبیا کرامؑ کی اکثریت اس سرزمین میں تشریف لائی جنہوں نے اپنی اپنی شریعت کے مطابق عبادت گاہیں تعمیر کیں۔ حرم شریف کا علاقہ انبیا کرامؑ کا مرکز رہا۔ اسی احاطہ میں ہیکل سلیمانی تھا۔ ہیکل کس مقام پر تھا اس بارے میں بتانا مشکل ہے۔

یہودیوں کے دعویٰ کے مطابق دیوار گریہ ہیکل سلیمانی کی باقی ماندہ دیوار ہے۔ اگر یہ بات صحیح ہے تو پھر ہیکل سلیمانی مسجد اقصیٰ سے دائیں طرف کچھ فاصلہ پر تھا۔ یہیں حضرت مریمؑ اور حضرت زکریا علیہ السلام گوشہ نشین رہے۔ حضرت مریمؑ جب گوشہ نشین تھیں تو اسی مقام پر حضرت جبریلؑ نے آپ کو بیٹے کی بشارت دی۔ اسی مقام پر حضرت زکریا علیہ السلام کو بڑھاپے میں بیٹے حضرت یحییٰ علیہ السلام کی بشارت ملی۔ چنانچہ حرم شریف کا مقام ہمیشہ محترم اور مقدس رہا اور اب بھی ہے۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم معراج پر تشریف لے جاتے وقت حرم شریف کے اس مقدس مقام پر بھی تشریف لائے تھے اور سیدھے صخرہ ٹیلے پر چڑھے تھے۔ یہاں ایک غار تھی جواب بھی موجود ہے۔

سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر یہاں مسجد کی بجائے کھلی جگہ اور غار تھی تو پھر قرآن پاک میں جس مسجد اقصیٰ کا ذکر ہے وہ کہاں ہے؟

یہ معلوم کرنے کے لئے عربی میں لفظ مسجد کا مفہوم اور مطلب جاننا ضروری

ہے۔ عربی لغت کے مطابق مسجد اقصیٰ کا مطلب "دور کی عبادت گاہ" ہے۔ المسجد میں جیم کو اگر زیر کے ساتھ ادا کیا جائے تو اس کا مطلب ہے ہر وہ مقام جو عبادت کے لئے استعمال ہوتا ہو چاہے وہاں سجدہ کیا گیا ہو یا نہ۔ لیکن اگر المسجد میں جیم کو زبر کے ساتھ ادا کیا جائے تو یہ فعل کا مطلب دیتا ہے یعنی وہ مقام جہاں سجدہ ادا کیا گیا ہو۔

اس پر غور کرنے سے ظاہر ہوتا ہے کہ اگر نماز کسی کھلی جگہ ادا کی جائے جہاں چار دیواری یا چھت نہ ہو تو بھی وہ مسجد ہے۔ قرآن پاک میں مسجد الحرام اور مسجد اقصیٰ کا جو ذکر ہے وہ دو مقدس مقامات کا ذکر ہے۔ ان میں سے پہلا عرب کے شہر مکہ میں اور دوسرا بیت المقدس میں ہے۔ یہ دونوں مقامات عبادت گاہوں اور مرکزیت کے حوالے سے اہمیت رکھتے ہیں۔ اسلام سے قبل حرم شریف کفار مکہ کے قبضہ میں تھا۔ وہاں کفار نے بت رکھے ہوئے تھے۔ اسی طرح یہاں مسجد اقصیٰ کا مقام بھی پیغمبروں کی عبادت گاہ رہا تھا۔ عبادت گاہوں کے حوالے سے ان کا ذکر لغوی معنوں میں مسجد کے نام سے کیا گیا۔

پیغمبروں کی سرزمین ہونے کے ناطے اس خطہ کو مرکزی حیثیت حاصل رہی ہے۔ اسی سرزمین میں انبیاء کرامؑ پر وحی نازل ہوتی رہی۔ اللہ کے برگزیدہ فرشتے اترتے رہے۔ اسی مناسبت سے اسلام کے ابتدائی دور میں مسلمانوں کا یہ قبلہ رہا اور قبلہ اول کہلایا۔ مسلمان نماز ادا کرتے تھے تو ان کا رخ کسی عمارت کی طرف نہیں بلکہ حرم شریف کے خطہ کی طرف ہوتا تھا جسے بیت المقدس کہتے ہیں۔ جب اس خطہ کی مرکزیت ختم ہو کر بیت اللہ منتقل ہوئی تو اللہ کے حکم سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا قبلہ بیت المقدس سے مسجد الحرام کی طرف پھیر دیا۔

ہم نے نماز مغرب مسجد اقصیٰ میں ادا کی۔ مسجد الحرام اور مسجد نبوی کے بعد مسلمانوں کے لئے یہ سب سے محترم مسجد ایک بڑے اور وسیع خطہ پر تعمیر ہے۔ مسجد کے تہہ خانہ میں پرانی مسجد ہے جہاں زمانہ قدیم کے کچھ تبرکات بھی رکھے ہوئے ہیں۔ ہمیں مسجد کا یہ حصہ دیکھنا نصیب نہ ہوا۔ مسجد کے بائیں طرف کھلی جگہ ہے۔ جبکہ مسجد کے دائیں طرف کچھ فاصلہ پر دیوار گریہ ہے۔

مسجد اقصیٰ جتنی بڑی ہے اس میں نمازی اتنے ہی کم تھے۔ نماز مغرب میں ایک سو کے لگ بھگ نمازی تھے۔ یہ دیکھا تو علامہ اقبال کا کہا یاد آیا:

واعظِ قوم کی وہ پختہ خیالی نہ رہی
برق طبعی نہ رہی شعلہ مقالی نہ رہی
رہ گئی رسمِ اذاں روحِ بلالی نہ رہی
فلسفہ رہ گیا تلقینِ غزالی نہ رہی
مسجدیں مرثیہ خواں ہیں کہ نمازی نہ رہے
یعنی وہ صاحبِ اوصافِ حجازی نہ رہے

قبلہ اول میں نمازیوں کی یہ نمایاں کمی مسلمانوں کے لئے یقیناً لمحہ فکریہ ہے!

نماز کے بعد ہماری ملاقات امام حرم سے ہوئی۔ یہ ایک نوجوان باہمت اور باخبر عالمِ دین تھے۔ جب ہم نے بتایا کہ ہم پاکستانی ہیں تو انہوں نے کشمیریوں کے بارے میں خصوصی طور پر پوچھا اور کہا کہ فلسطینی اور کشمیری کفار کے ہاتھوں مجبور ہیں۔ حاجی کرامت حسین نے مسجد اقصیٰ کے لئے اہلیانِ بریڈفورڈ کی طرف سے عطیات امام صاحب کے حوالے کیے۔ امام صاحب کی مرضی تھی کہ وہ مسجد کا تہہ خانہ کھلوا کر ہمیں اس کی زیارت کروائیں لیکن ہمارے قافلے کے چند سیانے جلدی میں تھے۔

ہم مسجد کے تہہ خانہ میں نہ جا سکے۔

حضرت سلیمان علیہ السلام

مسجد صخرہ کے صحن کے بالکل قریب جانب مشرق حضرت سلیمان علیہ السلام کا مقام ہے۔ جب ہم وہاں گئے تو کمرہ بند تھا۔ یہ ایک اوسط سائز کا کمرہ تھا جس میں حضرت سلیمان علیہ السلام کا تخت تھا۔ اس عظیم الشان پیغمبر اور بادشاہ کی حکومت جن و انس، پرند اور چرند پر تھی بلکہ چیونٹیوں تک پر انہی کی حکومت تھی۔

حضرت سلیمان علیہ السلام کے لئے پیغام رسانی کا کام ہدہد نامی ایک پرندہ کیا کرتا تھا۔ ہدہد نے ہی حضرت سلیمان علیہ السلام کو یمن کی حکمران ملکہ سبا کی حکومت کی خبر دی تھی۔ بعد میں ملکہ سبا بیت المقدس آئیں۔

حضرت سلیمان علیہ السلام کے محل میں ملکہ سبا کے داخل ہونے کا بیان قرآن

anjumhasnain2008@yahoo.com

پاک میں سورہ النمل میں اس طرح بیان کیا گیا ہے:

''اس سے کہا گیا کہ محل میں داخل ہو۔ اس نے جو دیکھا تو سمجھی کہ پانی کا حوض ہے اور اترنے کے لئے اس نے اپنے پائینچے اٹھا لیے۔ سلیمان نے کہا یہ شیشے کا چکنا فرش ہے۔ اس پر وہ پکار اٹھی ''اے میرے رب (آج تک) میں اپنے نفس پر بڑا ظلم کرتی رہی اور اب میں نے سلیمان کے ساتھ اللہ رب العالمین کی اطاعت قبول کر لی۔''

ان آیات کریمہ سے پتہ چلتا ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے محل کا فرش شیشے کا تھا۔ آج جب میں ان کے مزار پر کھڑا تھا تو میں نے شیشے کے محل میں رہنے والے پیغمبر کے مزار پر ایک سناٹا دیکھا۔

سبحان تیری قدرت

ہیکل سلیمانی

حضرت سلیمان علیہ السلام نے اپنے دورِ حکومت میں ہیکل سلیمانی تعمیر کروایا تھا جو سات سال کے عرصہ میں ایک کثیر سرمایہ سے پایہ تکمیل کو پہنچا۔ یہاں تابوتِ سکینہ رکھا گیا۔ روایت ہے کہ تابوتِ سکینہ کے صندوق میں آلِ موسیٰؑ اور آلِ ہارونؑ کے چھوڑے ہوئے تبرکات تھے۔ جن میں پتھر کی وہ تختیاں بھی تھیں جنہیں حضرت موسیٰؑ نے خود لکھوایا تھا، ایک بوتل میں من و سلویٰ بھرا ہوا تھا۔ اس کے علاوہ غالباً حضرت موسیٰ علیہ السلام کا عصا تھا۔

حضرت سلیمان علیہ السلام نے اپنے لئے ہیکل سلیمانی کے قریب ایک عالی شان تین منزلہ محل بھی بنوایا تھا۔ ملکہ سبا اسی محل میں آئی تھی۔

میں نے بچپن میں سنا تھا کہ مسجد اقصیٰ حضرت سلیمان علیہ السلام کے دور میں جنوں نے تعمیر کی تھی۔ جب پہلی منزل بن گئی تو حضرت سلیمان علیہ السلام ایک کرسی پر اپنے عصا کے سہارے بیٹھ گئے اور اسی حالت میں وفات پا گئے۔ لیکن جنوں کو پتہ نہ چل سکا اور وہ بدستور مسجد کی تعمیر کرتے رہے۔ اس دوران عصا کو گھن نے کھا کر کھوکھلا کر دیا تو وہ زمین پر گر پڑے۔ قرآن پاک کی سورہ سبا میں یہ واقعہ اس طرح مذکور ہے:

''اور جنوں میں سے ایسے جن ہم نے اس کے لئے مسخر کر دیئے تھے جو اس کے رب کے حکم سے اس کے آگے کام کرتے تھے اور جو ہمارے حکم سے کوئی ان میں سے انحراف کرتا تو ہم اس کو بھڑکتی ہوئی آگ کا مزا چکھاتے۔ وہ اس کے لئے جیسے وہ چاہتا محل اور مجسمے اور حوض جیسے بڑے بڑے لگن اور بھاری جمی ہوئی دیگیں بناتے تھے ...... پھر جب ہم نے سلیمان کو وفات دے دی تو ان جنوں کو اس موت پر مطلع کرنے والی کوئی چیز نہ تھی مگر زمین کا کیڑا (گھن) جو اس عصا کو کھا رہا تھا۔ پس جب وہ گر پڑا تو جنوں کو پتہ چل گیا کہ اگر وہ واقعی غیب داں ہوتے تو اس ذلت کے عذاب میں اتنی مدت تک مبتلا نہ رہتے''

حضرت عیسیٰ علیہ السلام

مقام حضرت سلیمان علیہ السلام کے علاوہ پرانے شہر میں عیسائیوں کے دعویٰ کے مطابق وہ مقام ابھی تک موجود ہے جہاں حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر مقدمہ چلا تھا۔ اس جگہ ایک بہت بڑا گرجا گھر ہے۔ جس کے اندر ان جگہوں کی نشاندہی کی گئی ہے جہاں پونٹس پیلاطس کی عدالت تھی جہاں سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو صلیب پر چڑھانے کا حکم دیا گیا تھا۔

جس راستہ سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام صلیب کندھے پر ڈال کر صلیب گاہ تک پہنچے اور جن بارہ جگہوں پر آپ تھک کر بیٹھے وہاں اب گرجا گھر ہیں اور دنیا بھر کے عیسائی ان کی زیارت کے لئے آتے ہیں۔

نماز عشاء مسجد صخرہ میں ادا کی۔ نماز عشاء کا وقت ساڑھے چھ بجے تھا۔ یوں تین بجے سے ساڑھے چھ بجے تک ساڑھے تین گھنٹے ہم نے اس مقام مقدس میں گزارے تھے۔ نماز ختم ہوئی تو نمازی بڑے دروازے کی طرف دوڑ پڑے۔ میں نے وجہ پوچھی تو گائیڈ نے کہا کہ مسجد اقصیٰ کی چابیاں یہودیوں کے پاس ہیں جو صبح فجر کے وقت حرم شریف کے بڑے دروازے کو کھولتے ہیں جس کے اندر مسجد اقصیٰ، مسجد صخرہ اور دوسرے مقامات ہیں۔ وہ

اسے عشاء کی نماز کی ادائیگی کے فوراً بعد بند کر دیتے ہیں۔ اگر کوئی باہر نکلنے میں دیر کرے تو اسے یہیں کھلے آسمان کے نیچے رات بسر کرنی پڑتی ہے۔

حضرت مریمؑ کا مزار

مسجد اقصیٰ اور مسجد صخرہ کی زیارتوں کے بعد ہم اس گلی سے باہر نکلے جس کے ایک مکان میں حضرت مریمؑ پیدا ہوئی تھیں۔ مکان دیکھنے کے بعد ہم پہاڑی سے نیچے اتر کر وادی کہدرون میں پہنچے جہاں عیسائیوں کے عقیدے کے مطابق حضرت مریمؑ کی قبر ہے۔ یہ ایک چرچ ہے جس کے تہہ خانے میں ایک غار کے اندر حضرت مریمؑ کی قبر بتائی جاتی ہے۔

مزار کے اوپر جو چرچ ہے اس کی تعمیر 1906ء میں شروع ہوئی اور 1910ء میں مکمل ہوئی۔ جرمنی کے بادشاہ ولیم دوم نے 1898ء میں بیت المقدس کا دورہ کیا تو سلطان عبدالمجید نے یہ جگہ اسے تحفہ میں دی اور پھر جرمن چرچ والوں نے اس مقام پر چرچ تعمیر کرنے کے لئے پیسے دیئے۔

یہ چرچ وادی کہدرون میں ہے جو بیت المقدس میں کافی مشہور ہے۔ یہ وادی ماریہ اور جبل زیتون کے درمیان ہے جو پرانے شہر کی ڈھلوان سے شروع ہو کر دوسرے کنارے تک جاتی ہے۔ شہر کا سب سے بڑا اور پرانا قبرستان بھی اسی وادی میں ہے۔ فرعون کی ایک بیٹی کی قبر بھی اسی قبرستان میں بتائی جاتی ہے۔

پرانے شہر کے جنوب مشرقی حصہ میں ماؤنٹ زائیون (Mount Zion) یعنی صیہون کی پہاڑی ہے۔ یہودیوں کی عالمی صیہونی تحریک زائیوان ازم (Zionism) کا نام اسی پہاڑی سے مستعار لیا گیا ہے۔ اس تحریک کا مقصد فلسطین میں یہودی ریاست قائم کرنا تھا۔ جب اسرائیل کا ملک قائم ہو گیا تو اب یہ لوگ اس ملک کو مضبوط کرنے میں مصروف ہیں۔ حضرت داؤد علیہ السلام کا مزار اسی علاقہ میں ہے۔ اس پہاڑی پر کھڑے ہو کر آپ دور تک اسرائیل کا علاقہ دیکھ سکتے ہیں۔

وادی نبی سموئیلؑ کا علاقہ شہر کے شمال کی طرف ہے۔ اس پہاڑی کی چوٹی پر ایک مسجد ہے جس میں حضرت سموئیلؑ نبی اللہ کا مزار واقع ہے۔ اگر موسم صاف ہو تو اس پہاڑی

ے آپ ایک طرف اردن کی پہاڑیاں اور دوسرے طرف بحیرہ روم کو دیکھ سکتے ہیں۔

مغربی یروشلم کے علاقے پر یہودیوں کا مکمل کنٹرول ہے۔ یہودی اسے اسرائیل کا حصہ تصور کرتے ہیں۔شروع شروع میں یہودیوں کی بستیاں شہر کے مغربی کنارے کی دو مشہور سڑکوں جیفا اور کنگ جارج کے اردگرد کے علاقے میں تھیں لیکن یہودیوں نے تیز رفتاری سے اپنی بستیوں میں اضافے کیے۔اب یہ علاقہ تقریباً نیا ہے جس میں جدید عمارتیں، ہوٹل اور صدارتی محل ہے۔اسرائیلی پارلیمنٹ اور میوزیم یہاں سے زیادہ دور نہیں ہیں۔

بدقسمتی سے ہمارا ہوٹل مغربی علاقے یعنی اسرائیل میں تھا اور ہوٹل کے مالک یہودی تھے۔ یہ بات ہمیں اس وقت معلوم ہوئی جب وہاں ہمارے قیام کا دوسرا دن تھا۔

بیت المقدس سے اسرائیل کا دارالخلافہ تل ابیب 63 کلومیٹر دور ہے۔ جبکہ غزہ کی پٹی 104 کلومیٹر اور جریکو 35 کلومیٹر ہے۔

ولایتی میم سے ملاقات

رات کا کھانا اسی ہوٹل میں کھایا جہاں ہمارا قیام تھا۔ کھانے کے بعد ڈائننگ ہال میں بیٹھے بات چیت کر رہے تھے کہ ایک گوری پاس آ کر بیٹھ گئی۔ گوری اکیلی تھی۔ دوران گفتگو اس نے بتایا کہ وہ انگلستان کے شہر بولٹن کی رہنے والی ہے۔ بولٹن مانچسٹر کے قریب واقع ہے۔وہ یہاں زیارتیں کرنے آئی ہوئی تھی۔ ہم سے باتیں کرتے ہوئے وہ اپنی مصروفیات کو بہت فخر سے بڑھا چڑھا کر بیان کرتی رہی۔ جہاں اُس نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا مقامِ پیدائش دیکھا تھا۔ مجھے کہنے لگی اگر تم بھی وہاں جاتے تو بخشے جاتے۔ جب میں نے اُسے بتایا کہ میں یہ ثواب حاصل کر چکا ہوں تو میم قدرے شرمائی۔ جب میں نے اُس سے پوچھا کہ کیا وہ الخلیل یا مسجد اقصیٰ گئی تھی تو وہ آئیں بائیں شائیں کرنے لگی۔

سفرِ فلسطین

☆ حضرت موسیٰ علیہ السلام

☆ بحیرۂ مردار

☆ قومِ لوطؑ کا علاقہ

☆ فلسطین

☆ وادی اردن

☆ جریکو

سفر فلسطین

ہم نے 29 نومبر بروز سوموار صبح ساڑھے سات بجے اپنے ہوٹل سے فلسطین کا رخ کیا۔

ہوٹل چھوڑنے سے قبل سب نے پیٹ بھر کر ناشتہ کیا۔ موسم خوشگوار تھا اور سورج کی روشنی میں ہر چیز بہت اُجلی اُجلی اور حسین لگ رہی تھی۔ ہم اپنی گاڑی میں محمد جیلانی گائیڈ کے ہمراہ یروشلم کے مغربی علاقے میں ونڈمل ہوٹل سے نکلے کر ہبریو (Hebrew) یونین کالج کے پاس سے گزر کر کچھ چڑھائی چڑھ کر پرانے شہر کے قریب سے گزرے۔ یہ سڑک شہر کے اس حصہ کے پاس سے گزرتی ہے جس پر یہودیوں کا قبضہ ہے۔ اسی طرح گاڑی پرانے شہر کی دیوار کے ساتھ ساتھ چلتی بسوں کے اڈہ کے پاس سے گزر کر سلطان سلیمان روڈ پر سے ہوتی ہوئی اوپر جا کر دائیں ہاتھ مڑ کر ایک ڈھلوان سڑک سے نیچے اتر کر دوسری طرف جبلِ زیتون کی طرف چلی گئی۔

اب مسجد اقصیٰ اور پرانا شہر ہمارے دائیں ہاتھ تھا۔ بائیں طرف ہبریو یونیورسٹی اور یونیورسٹی ہاسٹل تھا۔ جبلِ زیتون سے میں نے پیچھے مڑ کر مسجد اقصیٰ کو آخری بار دیکھا اور پھر گاڑی وہاں سے دوسری طرف ڈھلوان کی طرف چلتے ہوئے اس سڑک پر روانہ ہوگئی جو ویسٹ بنک میں جریکو اور وادی اردن کی طرف جاتی ہے۔ گائیڈ نے اعلان کیا کہ ہم ایک گھنٹے میں حضرت موسیٰ علیہ السلام نبی اللہ کے مزار پر پہنچ جائیں گے۔ تھوڑا ہی فاصلہ طے کیا تھا کہ گاڑی بھوری اور نیم سرخ رنگ کی پہاڑیوں میں پہنچ گئی۔ اب گاڑی مسلسل اترائی کی طرف سفر کر رہی تھی۔ سڑک سنگل لیکن پختہ اور اچھی حالت میں تھی۔

آہستہ آہستہ آبادی ختم ہوگئی۔ اب کہیں دور دور کہیں کہیں خانہ بدوشوں کے خیمے نظر آجاتے تھے۔ جو زمانہ قدیم سے اسی طرح رہ رہے ہیں۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام، حضرت موسیٰ علیہ السلام، حضرت یحییٰ علیہ السلام اور حضرت داؤد علیہ السلام نے بھی اسی انداز میں زندگی گزاری تھی۔ یہ لوگ ابھی تک بھیڑ بکریاں پال کر گزارہ کرتے ہیں۔ اونٹ اور بکریوں کے بالوں سے کپڑے اور خیمے تیار کرتے ہیں۔ بکریوں کا دودھ اور گوشت اُن کی غذا ہے۔ ہم نے دیکھا خانہ بدوش عورتوں اور مردوں نے عرب کے روایتی چوغا نما کپڑے پہنے ہوئے تھے۔

شام، حلب، دمشق، عراق، بغداد، کوفہ، کربلا، اردن اور فلسطین کے سفر کے بعد یہ پہلا موقع تھا کہ میں نے مقامی لوگوں کو عرب کے روایتی لباس میں دیکھا ورنہ ہر جگہ یورپی لباس ہی نظر آیا۔ بالکل اسی طرح جیسے ہم یاسر عرفات، حافظ الاسد (مرحوم)، صدام حسین اور شاہ حسین (مرحوم) کو بچپن سے انگریزی لباس میں دیکھتے آئے ہیں۔ اس سفر کے دوران مجھے یہ عملی تجربہ حاصل ہوا کہ قومی لیڈروں کے کردار، لباس، رہن سہن اور سوچ کا عوام پر کتنا گہرا اثر پڑتا ہے۔

صحرا کے بیچوں بیچ گہرے نالوں اور گھاٹیوں کے درمیان ہمارا سفر جاری رہا۔ پھر مٹی کی رنگت سرخ ہوتی گئی۔ اس میں ریت زیادہ اور مٹی کم تھی۔ گاڑی تنگ گھاٹیوں سے گزرتی ہوئی اپنی منزل کی طرف رواں دواں رہی۔ 28 کلو میٹر کے بعد ڈرائیور نے گاڑی دائیں ہاتھ موڑ دی۔ ویران صحرا میں ایک چھوٹی سی پہاڑی پر ایک عالی شان پرانی عمارت تھی۔ محمد جیلانی نے بتایا کہ یہی مقام حضرت موسیٰ علیہ السلام ہے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام

گاڑی روضہ کے بڑے دروازے کے سامنے آکر رک گئی۔ اس جگہ کا نام مقام نبی موسیٰ یا کوہ عبادیم ہے۔ اس وقت صبح کے آٹھ بجے تھے۔ عمارت کا دروازہ کھلا تھا ہم اندر داخل ہوئے لیکن اندر نہ کوئی بندہ تھا نہ بندے کی ذات۔

ایک دکان جس میں تحائف فروخت ہوتے تھے وہ بھی کھلی تھی لیکن دکان پر کوئی نہیں تھا۔ میں اور حاجی شاہ پال سیڑھیاں چڑھ کر عمارت کی چھت تک گئے لیکن کوئی انسان نظر نہ آیا۔ عمارت کے اندر گھومتے پھرتے آخر کار ہم اس مقام پر جا پہنچے جہاں حضرت موسیٰ علیہ السلام آرام فرما رہے ہیں۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قبر والا کمرہ تقریباً بیس فٹ چوڑا اور بیس فٹ لمبا ہے۔ قبر عرب کے دوسرے روایتی مزاروں کی طرح زمین سے تقریباً آٹھ فٹ اونچی ہوگی۔ مزار پر سبز چادریں ہیں۔ چادریں اتنی نئی اور قیمتی نہیں تھیں جتنی بغداد میں غوث الاعظمؒ کے دربار پر دیکھی تھیں۔ مزار کے ساتھ مسجد ہے۔

دعا مانگی اور میں نے اردگرد کے ماحول کا جائزہ لینا شروع کر دیا۔ ہمارے قافلہ میں شامل ''فرقہ تصویریہ'' تصویریں بنانے اور تبرکات کی تلاش میں اِدھر اُدھر بھاگ رہا تھا۔

اچانک میں نے دیکھا کہ ایک ناگن بل کھاتی جھومتی اٹکھیلیاں کرتی میری طرف آرہی ہے۔ اسے دیکھا تو مجھے قرآن پاک کی سورہ طٰہٰ کی یہ آیات یاد آئی:

فاذا حبالهم و عصيهم يخيل اليه من سحر هم انها

تسعىٰ فاو جس فى نفسه خيفة موسىٰ

(جب جادوگروں نے اپنے انچھر پھینکے تو یکا یک ان کے جادو سے

موسیٰ کو یہ محسوس ہونے لگا کہ ان کی لاٹھیاں اور رسیاں دوڑ رہی ہیں۔

پس موسیٰ اپنے دل میں ڈر سا گیا)

مجھے یوں محسوس ہوا جیسے فرعون کے دربار والے ناگ اور ناگنیں ابھی تک حضرت موسیٰؑ کا پیچھا کر رہے ہیں۔ میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے عصا کی تلاش میں اِدھر اُدھر دیکھ رہا تھا کہ اُسے پھینکوں تاکہ وہ ناگن کو ہڑپ کر لے۔ لیکن اس سے پہلے کہ مجھے وہ عصا ملتا وہ ناگن ایک حسینہ کی صورت میں میرے پاس آ کھڑی ہوئی۔ مسکرا کر مجھے سلام کیا اور تسلی

دی کہ گھبرائیے نہیں میں وہ نہیں جس کا آپ شک کر رہے ہیں ۔ میں فلسطینی مہاجر ہوں ۔ میرا نام ''ام اسماعیل'' ہے اور یہاں مزار کے متولی کی بیوی ہوں ۔

یہ سن کر میری جان میں جان آئی اور میں نے بھی لگے ہاتھ اپنا تعارف کروایا کہ اگر آپ ''ام اسماعیل'' ہیں تو میں بھی ''ابن اسماعیل'' ہوں ۔

اس پر وہ ہنسی اور ہم نے باتیں شروع کر دیں ۔ میں باتیں کر رہا تھا اور حاجی شاہ پال اس منظر کو ویڈیو میں فلم بند کرنے میں مصروف تھے ۔ ام اسماعیل نے میرے ساتھ فوٹو بنوایا اور مزار کے اندر جا کر چادریں ہٹا کر ہمیں اصل قبر دکھائی جو پتھر اور مٹی کی کچی حالت میں ہے ۔ اوپر لکڑی کا ڈھانچہ ہے ۔

ام اسماعیل نے دربار سے ایک چادر اُتار کر ہمارے حوالے کی اور دربار کے اوپر پڑی ہوئی چادروں میں سے ایک کے ٹکڑے کاٹ کر ہمیں دیئے ۔

سنا تھا کہ خوبصورت لوگوں کے دل بھی خوبصورت اور فیاض ہوتے ہیں ۔ اس کا عملی مظاہرہ میں نے وہاں دیکھا!

ہم باتیں کر رہے تھے تو ہمارے ایک ساتھی اندر آئے ہمارے پاس حضرت موسیٰ علیہ السلام کے مزار کی چادریں دیکھیں تو انہوں نے ام اسماعیل کو پیش کش کی کہ وہ پیسے لیکر دربار سے چادر اُتار کر انہیں دیں ۔ ام اسماعیل نے کانوں کو ہاتھ لگایا اور کہا کہ وہ پیسے لیکر چادر نہیں دیتی اس طرح نبی موسیٰ علیہ السلام مجھ سے اور میرے خاندان سے ناراض ہو جائیں گے ۔

ام اسماعیل نے بتایا کہ یہ مزار سلطان صلاح الدین ایوبی نے 1187ء میں تعمیر کروایا تھا ۔ اس عمارت کے 160 کمرے ہیں ۔ میں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے مزار سے ایک گائیڈ بک ، کچھ تصویریں اور چند ڈیکوریشن پیس خریدے ۔ جب ہم خریداری اور دوسری معلومات جمع کرنے میں مصروف تھے تو ہمارا ''فرقہ تصویریہ'' گاڑی میں بیٹھا لال پیلا

ہو رہا تھا کہ یہ خواہ مخواہ ویرانوں میں وقت ضائع کر رہے ہیں۔

حقیقت یہ تھی کہ ان بندگان خدا کو یہ سمجھ ہی نہیں تھی کہ یہ اس جلیل القدر پیغمبر کا مزار ہے جو کلیم اللہ تھے۔ آپؑ کو اللہ نے کوہ طور پر بلایا اور ہم کلام ہوئے۔ یہ شرف کسی بنی آدم کو نصیب نہیں ہوا۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرعون کے شاہی محل میں پرورش پائی۔ پھر انہوں نے اپنی قوم کی بہتری اور فلاح و بہبود اور اللہ کی حاکمیت کی خاطر فرعون سے ٹکر لی اور اپنی قوم کو لے کر صحرائے سینا کی طرف نکلے تو فرعون کی فوجوں نے اُن کا پیچھا کیا۔ تو اللہ نے آپ اور آپؑ کی قوم کیلئے سمندر خشک کر دیا تھا۔ آپؑ اپنی قوم کو لے کر دوسرے کنارے پہنچے تو سمندر اپنی اصل حالت میں واپس آ گیا۔ فرعون کو اللہ تعالیٰ نے پانی میں غرق کر کے اس کی لاش کو رہتی دنیا تک ہر ایک کے لئے باعث عبرت بنا دیا۔

سنا ہے فرعون کی لاش اب بھی مصر کے عجائب گھر میں دنیا کے لئے عبرت کے طور پر محفوظ ہے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام واحد پیغمبر ہیں جن سے اللہ تعالیٰ کوہ طور پر ہم کلام ہوئے۔ اسی مناسبت سے ان کا لقب کلیم اللہ ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ایک ہاتھ میں ایک خاص قسم کی چمک تھی جو ید بیضا کے نام سے مشہور ہے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قوم کو ہی اللہ تعالیٰ نے صحرائے سینا میں من و سلویٰ دیا تھا اور پھر کتاب عطا کی۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی اس قوم، کو جو یہودی کہلاتی ہے، بڑی نعمتوں سے نوازا تھا لیکن انہوں نے نبی اور اللہ کا کہنا نہ مانا اور نافرمان ہو گئے، چنانچہ اللہ نے حکم دیا کہ اے موسیٰ تم اور تمہاری قوم چالیس سال تک بیت المقدس میں داخل نہیں ہو سکتے۔ بیت المقدس جاتے ہوئے حضرت موسیٰ علیہ السلام جب اس مقام پر پہنچے تو اللہ کو پیارے ہو گئے۔

بحیرہ مردار (Dead Sea)

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے مزار پر آدھا گھنٹہ رہنے کے بعد ہم ساڑھے آٹھ بجے چلے ۔ ابھی ایک کلومیٹر ہی فاصلہ طے کیا تھا کہ ہم بحیرہ مردار پہنچ گئے ۔

بحیرہ لوط" کو سمندر کی بجائے ایک بڑی جھیل کہنا زیادہ مناسب ہے ۔ اس جھیل کی لمبائی 76 کلومیٹر اور چوڑائی تین کلومیٹر سے سولہ کلومیٹر کے درمیان ہے ۔ اس میں دوسرے سمندروں کے مقابلے میں 25 فیصد زیادہ نمک ہے اس لئے اس پانی میں کوئی زندہ مخلوق نہیں رہ سکتی ۔ اسی بناء پر اسے Dead Sea یعنی بحیرہ مردار کے نام سے بھی پکارا جاتا ہے ۔ مقامی لوگ اسے بحیرہ لوط" کہتے ہیں ۔

سمندر کا نمکین پانی جلدی بیماریوں کے لئے موزوں ہے اور بہت سے لوگ سمندر کے کنارے غسل کر کے بیماریوں کا علاج کرتے ہیں ۔

بحیرہ لوط" میں دریائے اردن آ کر ملتا ہے ۔ دریائے اردن کو بھی آپ دریا نہیں بلکہ ایک چھوٹی ندی یا نہر کہہ سکتے ہیں جس کا پانی گہرا ہے نہ پاٹ چوڑا ۔ یہ دریا 252 کلومیٹر لمبا ہے ، جو شام کی پہاڑیوں سے نکل کر اردن سے ہوتا ہوا فلسطین کے علاقہ میں آ کر بحیرہ لوط" میں ملتا ہے ۔

قوم لوط" کا علاقہ

بحیرہ لوط" کے کنارے سے ہماری گاڑی بائیں مڑ کر دریائے اردن کے کنارے کنارے اس طرف چل پڑی جدھر سے یہ دریا آتا ہے ۔ اگر ہم جانب جنوب بحیرۂ لوط" کے ساتھ ساتھ سفر کرتے تو ہم اس علاقے میں پہنچ جاتے جسے قوم لوط" کا علاقہ کہا جاتا ہے ۔ اس علاقہ میں قوم لوط" سدوم کے شہر میں آباد تھی جس پر اللہ تعالیٰ نے پتھروں کی بارش کی تھی ۔ وہ قوم تباہ ہوئی ۔ اسی واقعہ کی مناسبت سے آج تک لوگ اس سمندر کو بحیرہ لوط" کہتے ہیں ۔

فلسطین

فلسطین کا علاقہ ویسٹ بنک اور غزا کی پٹی پر مشتمل ہے۔ دونوں علاقوں کے درمیان اسرائیل کا علاقہ اسی طرح واقع ہے جس طرح مشرقی اور مغربی پاکستان کے درمیان بھارت ہوا کرتا تھا۔ غزا کی پٹی بحیرہ روم کے کنارے بیت المقدس سے ایک سو چار کلومیٹر کے فاصلہ پر ہے۔ غزا کی پٹی اور ویسٹ بنک کے درمیان تقریباً سو میل کے علاقہ پر اسرائیلیوں کا قبضہ ہے۔

غزا کی آبادی ایک ملین افراد پر مشتمل ہے جس میں 77 فیصد مہاجر ہیں جنہیں ان کے علاقوں اور دیہاتوں سے اسرائیلیوں نے نکال کر وہاں یہودی بستیاں بسالی ہیں۔ غزا میں یہ مہاجر خیمہ بستیوں میں رہتے ہیں۔ انکی آبائی زمینوں پر امریکی، یورپی اور روسی یہودی آباد ہو چکے ہیں جو دن بدن اپنی ان بستیوں میں اضافے کر رہے ہیں۔

ویسٹ بنک کے علاقہ میں 1.9 ملین لوگ رہتے ہیں۔ فلسطین کی کل آبادی سات ملین ہے۔ ان اعداد و شمار سے پتہ چلتا ہے کہ تقریباً %60 فیصد فلسطینی بے وطنی کی زندگی گزار رہے ہیں۔ اس وقت فلسطینی مہاجروں کی تعداد چار ملین ہے۔ روایت ہے کہ غزا میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پردادا ہاشم ابن عبدالمناف کی قبر بھی ہے۔ ویسٹ بنک میں بیت المقدس کا مشرقی علاقہ، بیت اللحم، حبرون، رملا اور وادی اردن کا علاقہ شامل ہے۔

وادئ اردن

بحیرۂ لوطؑ سے ہی فلسطین کا وہ خوبصورت ترین علاقہ شروع ہو جاتا ہے جسے وادئ اردن کہتے ہیں۔ میرے خیال میں یہ علاقہ تقریباً سو کلومیٹر لمبا اور تقریباً تیس کلومیٹر چوڑا ہے۔

اگر آپ مشرق کی طرف منہ کر کے کھڑے ہوں تو آپ کے دائیں طرف وادئ اردن اور بائیں طرف اسرائیل ہے۔ دونوں ملکوں کے درمیان یہ دنیا کا خوبصورت ترین اور بدقسمت ترین علاقہ واقع ہے۔ ہمارا یہ سفر اسی وادی سے شاہ حسین برج تک ہوا۔

جریکو

بحیرہ لوط سے چل کر ابھی ہم نے نو کلومیٹر سفر ہی طے کیا تھا کہ ہم جریکو جا پہنچے۔

جریکو میں فلسطین کے سربراہ یاسر عرفات رہتے ہیں۔ یہ ان کی کاغذی فلسطینی ریاست کا دارالخلافہ بھی ہے۔ جریکو کی آبادی 15000 افراد پر مشتمل ہے۔

بیت المقدس کی طرف سے آتے ہوئے وادی اردن میں سب سے پہلا شہر جریکو کا ہے۔ تاریخی لحاظ سے جریکو بہت قدیم شہر ہے۔ جب ہم اس شہر میں داخل ہوئے تو ہمیں عرفات ہوٹل کی عمارت نظر آئی۔ جو سب سے اونچی ہے۔

یہ ایک چھوٹا سا خوبصورت میدانی شہر ہے۔ یروشلم سے نکالے جانے والے بہت سے فلسطینی مسلمانوں کے کیمپ بھی ہم نے یہاں دیکھے جن میں یہ لوگ گذشتہ پچاس سالوں سے رہتے ہیں۔ عیسائی اس ٹاؤن کو مقدس قرار دیتے ہیں۔ ان کے مطابق حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے زندگی کے کچھ دن یہاں گزارے تھے۔ یہاں ایک چوک میں ہم نے وہ درخت دیکھا جس کے بارے میں عیسائیوں کا عقیدہ ہے کہ یہ درخت حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے دور کا ہے اور اُسے حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے بھی دیکھا تھا۔

جریکو سے کنگ حسین برج تک راستہ میں نران، گلیل، تمر، یاقت، آرگامین اور بیت الشیان کے قصبے دیکھے۔ کنگ حسین برج سے اس پار اردن کا علاقہ ہے۔ بائیں طرف سامریہ کا علاقہ ہے۔ یہ وہی علاقہ ہے جہاں کسی زمانے میں اسرائیلی ریاست سامریہ ہوا کرتی تھی۔

یہودی اپنے عروج کے زمانے میں جب متحدہ ریاست میں رہتے تھے اس وقت انہوں نے آپس میں لڑنا شروع کر دیا تھا۔ آپس کے اختلافات کی وجہ سے متحدہ ریاست دو حصوں میں تقسیم ہوگئی تھی۔

ایک یہودیہ اور دوسری سامریہ۔

جریکو سے نکلے تو مکئی کے کھیت، سنگتروں، انجیر، زیتون، آلوچہ کے باغات اور

بھیڑوں کے ریوڑ دیکھے۔ سڑک کے کنارے فلسطینی کسانوں کو کھیتوں میں کام کرتے دیکھا۔ تو جی خوش ہو گیا۔

لیکن............!

محمد جیلانی گائیڈ نے بتایا خوش ہونے کی ضرورت نہیں' محنت یہ لوگ کرتے ہیں اور اس کا پھل یہودی کھاتے ہیں۔

جب میں پہلی بار محمد جیلانی سے ملا تھا تو مجھے شک ہوا تھا کہ یہ اسرائیل کا ایجنٹ ہے لیکن گذشتہ تین دنوں سے اس نے مسلمانوں کی بے کسی اور یہودیوں کے ظلم وستم کی باتیں سنائیں تو میری رائے بدل گئی۔

میں نے محمد جیلانی سے پوچھا کہ تم یہودیوں کے اتنے خلاف کیوں ہو؟

اس نے جواب دیا: "میرے خاندان کو گاؤں سے بے دخل کر دیا گیا تھا۔ میرا باپ، ماں، بہن بھائی تمام رشتے داروں کو یہودیوں نے ظلم کے خلاف آواز بلند کرنے کے جرم میں گولی مار کر شہید کر دیا۔ اور اب میں اکیلا ہوں۔ اگر میرے ماں باپ، بہن بھائی اور میرا آبائی وطن نہیں رہا تو ایسے میں مجھے اپنی زندگی سے بھی کوئی پیار نہیں"

محمد جیلانی کی دکھی داستان سنتے سنتے ہم کنگ حسین برج پر پہنچ گئے۔ یہ وہی اسرائیلی سرحد ہے جہاں سے تین دن پہلے ہم فلسطین میں داخل ہوئے تھے۔

سرحد پر معمول کی کارروائی ہوئی۔

محمد جیلانی اور ڈرائیور کو رخصت کیا۔

اور............

10:45 پر ہم نے اسرائیل کو خدا حافظ کہا۔

دوسری بس میں بیٹھنے کے بعد ہم اسرائیلی علاقہ سے نکل کر دریائے اردن کو کنگ حسین برج سے عبور کر کے اردن کے علاقہ میں پہنچے۔

☆☆☆
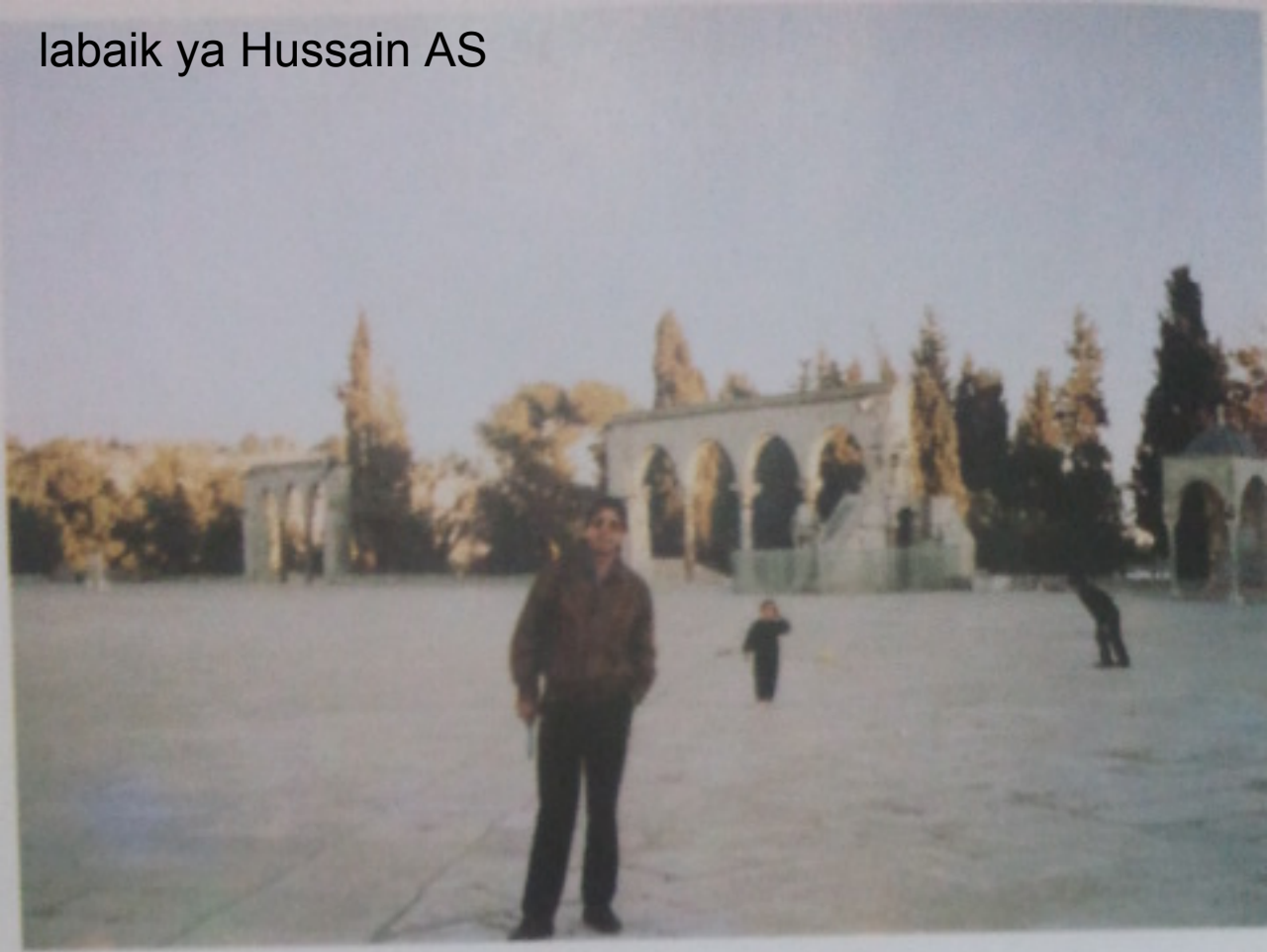
مسجد صخرا کا بیرونی احاطہ جس میں بچے کھیل کود میں مصروف ہیں۔

مسجد صخرا کے نیچے غار میں مصنف سکیورٹی گارڈ اور ظہور آرٹسٹ کے ساتھ۔

حبرون کے شہر کا ایک منظر' وسط میں حضرت ابراہیم خلیل اللہ، حضرت اسحاق ؑ، حضرت یعقوب ؑ کا روضہ اور مسجد

بیت اللحم شہر کا ایک منظر۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے روضہ کے باہر جشن منایا جا رہا ہے۔
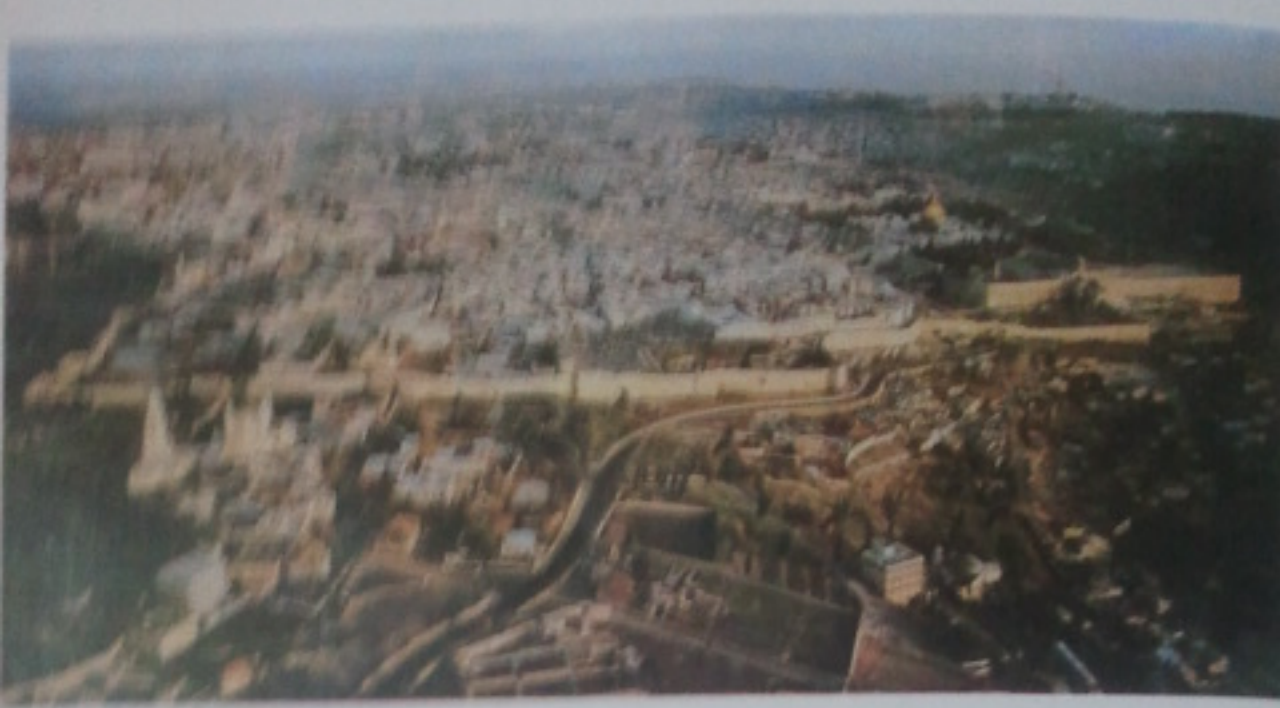
بیت المقدس کے پرانے شہر کا ایک منظر اور گرد دیوار نظر آ رہی ہے۔

بیت المقدس کے پرانے شہر کا ایک منظر سامنے مسجد اقصیٰ اور ساتھ مسجد صخرا نظر آ رہی ہیں۔

مسجد صخرا کے گنبد کا اندرونی سنہری منظر فرش پر جو روشنی نظر آ رہی ہے یہاں نیچے وہ غار ہے جس کے بارے میں روایت ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم یہاں سے معراج پر روانہ ہوئے تھے۔

مصنف وادی اردن میں حضرت ابو عبیدہؓ کے مزار پر

مصنف اردن کے دارالخلافہ عمان میں ایک شاہراہ پر کھڑا ہے۔
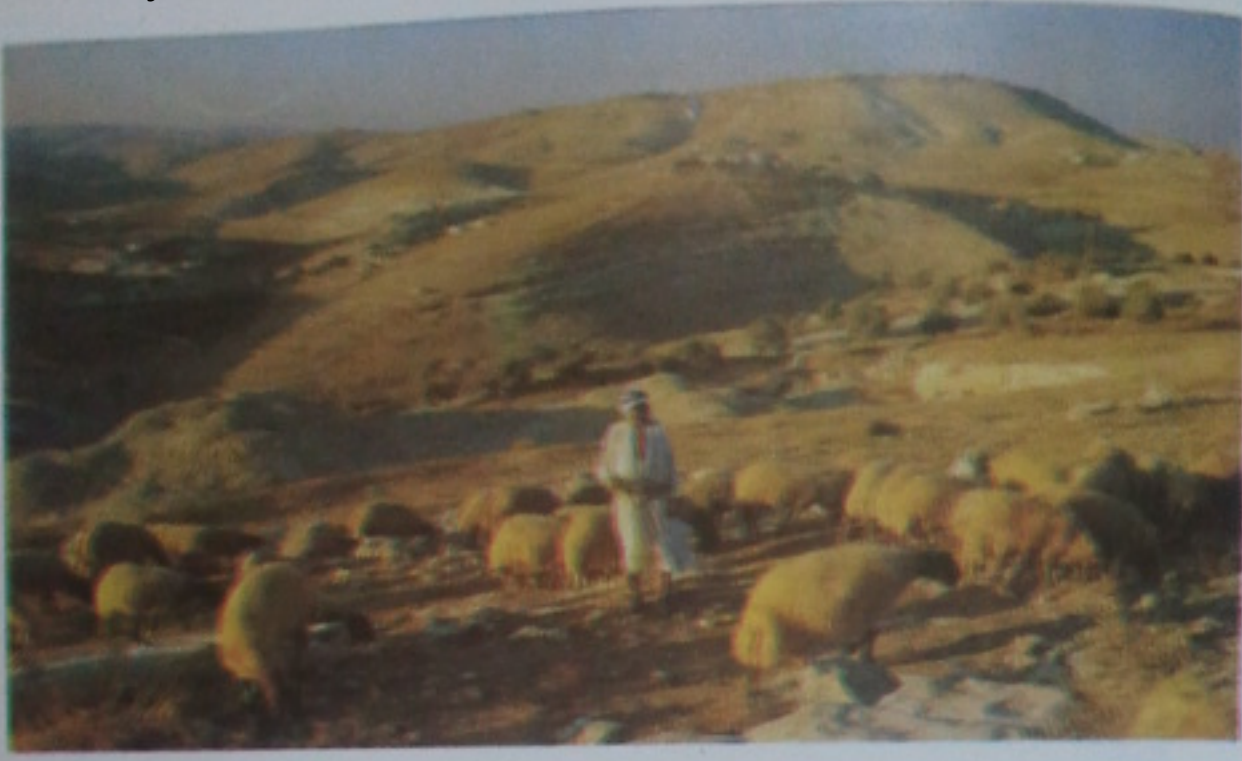
بیت اللحم کے نواحی علاقے کا ایک منظر۔

بیت الحم شہر کا ایک منظر

فلسطین کے
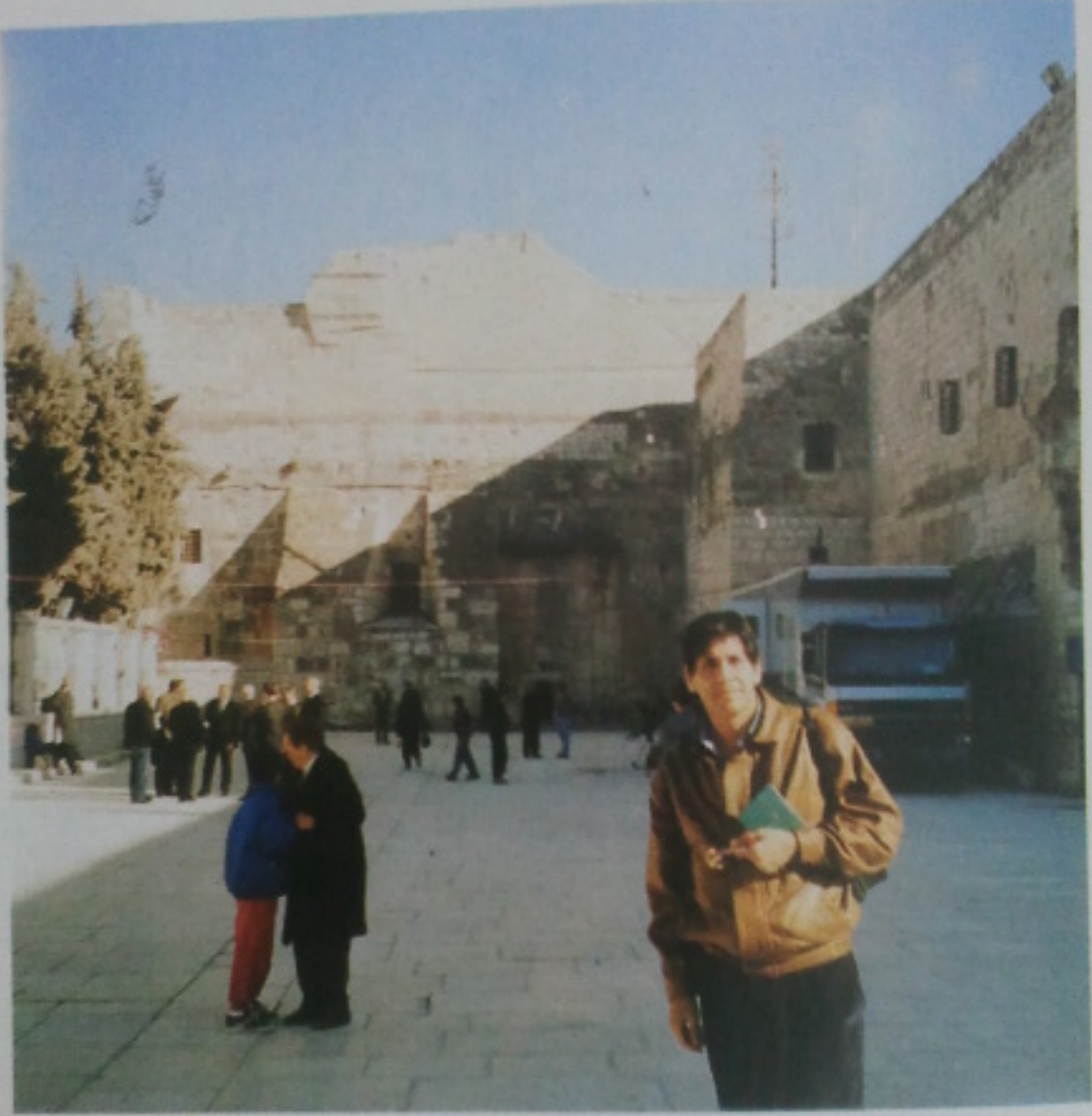
بیت اللحم میں ۔ دنیا کا سب سے پہلا چرچ جس کے بارے میں روایت ہے کہ اس کے اندر حضرت
عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش ہوئی تھی

مصنف اس مقام پر جہاں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش ہوئی تھی۔ زمین پر ستارے کا نشان اس مقام کی نشاندہی کر رہا ہے۔

مصنف حضرت موسیٰ کے مزار پر دعا مانگ رہا ہے۔

میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے روضے کا ایک منظر۔

مصنف حضرت موسیٰ علیہ السلام کے مزار پر ام اسماعیل کے ساتھ۔

اردن

☆ اردن ویلی

☆ عمان

☆ زرقا

☆ اربد

☆ یرموک

☆ اردن سے شام تک

اردن

مشرق وسطیٰ میں اردن کی بڑی اہمیت ہے۔ اس کی سرحدیں سعودی عرب، اسرائیل، شام اور عراق کے ساتھ ملتی ہیں۔ ملک کا اسی فیصد علاقہ صحرائی اور بیس فیصد قابل کاشت ہے۔ سعودی عرب کی سرحد کے قریب کچھ علاقہ سمندر کے ساتھ بھی ملتا ہے۔ ملک کا دارالخلافہ عمان ہے۔ اربد اور زرقا اس کے مشہور شہر ہیں۔

اردن کی آبادی 3,170,000 اور رقبہ 37,737 مربع میل ہے۔ کرنسی دینار ہے۔ ایک دینار تقریباً ایک برطانوی پونڈ کے برابر ہے۔ اردن میں 95 فیصد آبادی مسلمانوں کی اور 5 فیصد عیسائیوں کی ہے۔

اردن یاد آتے ہی شاہ حسین کا نام یاد آجاتا ہے۔ شاہ حسین تھے تو عرب!
لیکن............

رغبت "چٹی چمڑی" سے زیادہ تھی۔ ملکہ عالیہ اور ملکہ نور دونوں ملک فرنگ سے بیاہ کر لائے تھے۔ اردن کے موجودہ بادشاہ کی ماں بھی برطانوی نژاد ہے۔ اس طرح بادشاہ کا ننھیال برطانیہ ہے۔ اسی رشتہ داری کی وجہ سے امریکی بھی اردن کو اپنا ہی گھر سمجھتے ہیں۔

سمجھنا بھی چاہئے جہاں کی بہو بیٹی ہوتی ہے ان کا تو اس گھر اور ملک پر پورا حق ہوتا ہے۔ اسی رشتہ داری نے فلسطین کے گوریلے لیڈر یاسر عرفات کا دل اس طرح موم کیا کہ اس کے ہاتھ سے بندوق چھین کر ایک نصرانی دوشیزہ کا ہاتھ تھما دیا۔

یاسر عرفات کے دل میں یہودیوں کے لئے جو نفرت، غصہ اور حقارت بھری ہوئی تھی اسے صاف کرنے کے لئے وہ اٹھائیس سالہ دوشیزہ محبت کا لباس فاخرہ پہن کر عمر رسیدہ عرفات کے دل میں جا اُتری۔

یوں ....

جو کام امریکہ جیسی سپر طاقت نہ کر سکی۔ وہ کام نازک دوشیزہ نے آنکھ کے اشارے سے کر دکھایا۔ مرزا غالب بھی بہت عرصہ پہلے اسی صورت حال میں گرفتار ہو کر پچھتائے تھے:

عشق نے غالب نکما کر دیا
ورنہ ہم بھی آدمی تھے کام کے

جب تک یاسر عرفات کے ہاتھ میں بندوق اور منہ میں زبان رہی اُس وقت تک اس شیر کی گونج سے وائٹ ہاؤس کانپتا رہا۔ اسی وجہ سے دنیا نے انہیں عزت دی۔ وہ جس ملک میں بھی گئے انہیں ملک کے سربراہ جیسی عزت ملی۔

لیکن!

جوں ہی یاسر عرفات کے دل سے جوش و جذبہ، ہاتھ سے بندوق اور منہ سے گونج دار گرج غائب ہوئی دنیا نے بھی آنکھیں پھیر لیں۔

اب......

ممکن ہے!

یاسر عرفات خود بھی اس انقلابی عرفات کو ڈھونڈ رہا ہو جس نے مسئلہ فلسطین کو دنیا کے سامنے پیش کیا اور منوایا تھا۔

اور جس کا نصب العین تھا کہ:

میں تجھ کو بتاتا ہوں تقدیر امم کیا ہے
شمشیر و سناں اول طاؤس و رباب آخر!

اب وہی شخص ''ہاتھ پر ہاتھ دھرے منتظر فردا ہے''۔

ایک طرف یہ حال ہے اور دوسری طرف وہ صورت حال جس کا ذکر میں نے اسی کتاب کے فلسطین اور بیت المقدس کے باب میں کیا ہے۔

جو لوگ یہ جاننے کے لئے بیتاب ہیں کہ مسلمانوں پر آج زوال کیوں ہے انہیں چاہئے کہ وہ مسلمانوں کے لیڈروں کے کردار کا جائزہ لیا کریں۔

خوش آمدید اردن

کنگ حسین برج کو عبور کر کے ہماری بس اردن کی سرحد پر کھڑی ہوئی تو میری جان میں جان آئی۔ تین دن اسرائیل میں گزارے لیکن دل کو دھڑکا لگا رہا۔ میں نے ساتھیوں سے

کہہ دیا تھا کہ میرا تعارف کہیں بھی بحیثیت رائٹر نہ کروانا۔

چونکہ!

یہودی شکی قوم ہے۔ ہر بات کو شک کے ساتھ دیکھتی ہے اور ہر مسلمان کو اپنا دشمن سمجھتی ہے۔

اردن میں ہم صبح 11:15 بجے داخل ہوئے۔ امیگریشن احکام نے 35 ڈالر ویزا فیس وصول کر کے ویزے جاری کر دیئے۔ اسرائیل میں داخل ہونے کے لئے ویزا فیس 21 ڈالر ہے۔

حکام ویزا کی کارروائی میں مصروف تھے اور میں باہر دھوپ میں بیٹھ کر اردگرد کا جائزہ لیتا رہا۔ یہ بارڈر دریائے اردن کے کنارے ہے۔ ایک طرف اسرائیلی اور دوسرے کنارے اردن والوں نے ڈیرے ڈالے ہوئے ہیں۔ دریا کے دونوں کناروں پر اونچے اونچے دو مینار ہیں جو اس قدر قریب ہیں کہ ہر دو ملکوں کے فوجی آسانی سے ایک دوسرے کو دیکھ سکتے ہیں بلکہ بوریت کی صورت میں آنکھ مٹکا بھی کر سکتے ہیں۔

بلکہ کرتے بھی ہیں!

میں نے جائزہ لیا اسرائیلی فوجی لڑکے اور لڑکیاں چاک و چوبند تھیں اور ان کے مقابلہ میں ہمارے اردنی بھائیوں کے پیٹ بڑھے ہوئے تھے اور اُن کی نظریں سرحد پار اسرائیلی لڑکیوں پر یوں جمی تھیں، جیسے وہ کسی دشمن کی بجائے ''محبوبہ'' کو دیکھ رہے ہوں۔

میں یہ تماشا دیکھ رہا تھا کہ سالار قافلہ محمد یونس اویسی صاحب نے نوید سنائی کہ ہمارے ویزے ہو گئے ہیں۔

میں اٹھا، اردن کے فوجیوں کی دیکھا دیکھی اسرائیلی فوجی لڑکیوں پر دور سے آخری نظر ڈالی، بیگ اٹھایا اور ہال کے اندر چلا گیا۔ جہاں قافلے والے ائرکنڈیشنڈ ہال میں بیٹھے خوش گپیاں کر رہے تھے۔ مجھے پسینے میں شرابور دیکھ کر حاجی غنی نے مجھے مخاطب کیا:

''نظامی جی! زیادہ محنتیں نہ کریں۔ خیال رکھیں کہیں کتاب لکھتے لکھتے آپ کی اپنی چھٹی نہ ہو جائے۔''

کسٹم ہاؤس سے باہر نکلے تو بارہ بج کر دس منٹ ہو چکے تھے۔ جس کا مطلب یہ تھا کہ ہم نے بیت المقدس سے یہاں تک کا سفر پانچ گھنٹوں میں طے کیا تھا۔ سفر تو سو کلومیٹر سے کم ہوگا لیکن راستے میں زیارتوں اور ویزے وغیرہ کے سلسلہ میں کافی وقت صرف ہوا۔

کسٹم ہاؤس سے باہر گاڑی عمان لے جانے کے لئے تیار کھڑی تھی۔ گاڑی میں بیٹھے تو اس نے وادی اردن کے کنارے کنارے اسی رخ چلنا شروع کر دیا جس رخ سے ہم دریائے اردن کے دوسرے کنارے کے ساتھ ساتھ فلسطین میں سفر کر کے آئے تھے۔ وادی کا یہ کنارہ بھی اسی طرح سرسبز، زرخیز اور خوبصورت تھا۔ جس طرح دریا کے اس پار تھا۔ اس علاقہ میں اکثریت فلسطینی مہاجرین کی ہے جنہیں اسرائیلیوں نے 1948ء میں ملک بدر کر دیا تھا۔

حکومت اردن نے اس علاقے کی آبی ضروریات پوری کرنے کے لئے دریائے اردن سے عبداللہ نامی نہر نکالی ہے۔ یہ نہر مکئی کے کھیتوں، چاول کی فصلوں، سنگتروں، انجیر، زیتون اور انگوروں کے باغات کو سیراب کرتی ہے۔ ہم جس سڑک پر سفر کر رہے تھے وہ پختہ سنگل روڈ تھی۔ ہمارے دائیں ہاتھ دریائے اردن اور اس پار فلسطین کا علاقہ تھا۔ بائیں ہاتھ پہاڑی سلسلہ تھا۔ جس کے دوسری طرف اردن کا دارالخلافہ عمان ہے۔

تقریباً دس میل کا فاصلہ طے کرنے کے بعد گاڑی ایک خوبصورت اور جدید مسجد کے سامنے آ کر رک گئی۔ گائیڈ نے بتایا کہ یہ فحل کا علاقہ ہے۔ حضرت عمر ابن خطابؓ کے دور خلافت میں اسی جگہ فحل کی جنگ ہوئی تھی۔ اس علاقہ میں حضرت معاذ بن جبلؓ، حضرت ابی عبیدہ بن جراحؓ، حضرت شرجیل بن حسنہؓ اور حضرت ضرار بن ازدرؓ کے مزارات ہیں۔ یہ مزارات اسی سڑک پر تھوڑے فاصلہ پر واقع ہیں۔

ابی عبیدہ بن جراحؓ کا مزار

حضرت ابی عبیدہ جراحؓ کا شمار عشرہ مبشرہ یعنی اُن دس صحابہ میں ہوتا ہے جنہیں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے زندگی میں ہی جنت کی بشارت دے دی تھی۔ اس عظیم سپہ سالار اور صحابی کے مزار کو حکومت نے حال ہی میں از سر نو تعمیر کیا تھا۔ اس وقت تک جتنے مزاروں کی زیارت کر چکا ہوں یہ سب سے جدید اور خوبصورت سنگ مرمر کا ہے۔ بالکل پاکستان اور بھارت میں بنائے جانے والے مزاروں کی طرح۔ قبر زمین سے تقریباً تین فٹ بلند تھی۔ قبر کے سامنے پاکستانی قبروں کی طرز پر ایک تختی نصب تھی۔ جس پر حضرت ابی عبیدہؓ کا نام اور تفصیل لکھی ہوئی ہے۔ مزار کے ساتھ ایک خوبصورت مسجد، لائبریری اور ایک جدید مدرسہ بھی ہے۔ یہ عمارت ایک وسیع اور کھلی جگہ پر تعمیر کی گئی ہے۔

ابی عبیدہؓ ایک عظیم سپہ سالار تھے۔ حضرت عمرؓ نے حضرت خالد بن ولیدؓ کو معزول

کیا تو ان کی جگہ ابی عبیدہؓ کو تعینات کیا تھا۔ شام، یرموک کی جنگ، بیت المقدس اور دوسرے بہت سے معرکوں کی آپ نے قیادت کی اور مسلمانوں کو کامیابی سے سرفراز فرمایا تھا۔

18 ہجری میں وادی اردن میں وبا پھیلی تو مسلمانوں کی فوج اس علاقہ میں مقیم تھی۔ حضرت عمرؓ نے حکم دیا کہ فوج کو کسی اور جگہ منتقل کر دیا جائے لیکن موت سے نہ ڈرنے والے صحابہ نے یہاں سے جانے سے انکار کر دیا۔ اسی وبا میں ابی عبیدہؓ کا انتقال ہو گیا۔ انتقال سے قبل انہوں نے معاذ بن جبلؓ کو اپنا جانشین نامزد کیا۔ کچھ دنوں بعد وہ بھی اللہ کو پیارے ہو گئے انہوں نے عمرو بن العاصؓ کو اپنا قائم مقام بنایا۔ ان سب مسلمان جرنیلوں کی قبریں وادی اردن میں ایک دوسرے سے قریب قریب واقع ہیں۔ اب دن کا ڈیڑھ بج چکا تھا۔ نماز ظہر ادا کر کے ابو عبیدہؓ کے مزار سے علامہ اقبال کی زبان میں رخصت مانگی:

اے بو عبیدہ رخصت پیکار دے مجھے
لبریز ہو گیا مرے صبر و سکوں کا جام

ابی عبیدہؓ کے مزار سے چلے تو علاقے کی خوبصورتی پہلے کی طرح برقرار رہی۔ میں نے دیکھا کسان جدید طریقوں سے کاشت کاری کر رہے تھے۔ ٹریکٹر استعمال ہو رہے تھے۔ بعض جگہوں پر فوارے سے فصلوں کو پانی دیا جا رہا تھا۔ موسمی اثرات سے فصلوں کو محفوظ کرنے کے لئے بعض کھیتوں پر پلاسٹک ڈالے ہوئے تھے جنہیں دور سے دیکھ کر مجھے محسوس ہوتا تھا جیسے وہ خیمے ہوں۔ قریب جانے پر پتہ چلتا تھا کہ وہ خیمے نہیں بلکہ ڈھانپی ہوئی فصلیں ہیں۔ یوں ہی سفر کرتے کرتے ہم جنوبی سناء کے علاقہ میں پہنچ گئے۔

سناء کے علاقہ سے گاڑی بائیں مڑ کر پہاڑی چڑھنے لگی۔ ہم نے اب تک کنگ حسین برج سے یہاں تک 50 کلومیٹر فاصلہ طے کیا تھا۔ ہمیں عمان پہنچنے کے لئے مزید پچاس کلومیٹر کا فاصلہ طے کرنا تھا۔

یہاں سے وہ پہاڑی سفر شروع ہوا جسے طے کر کے ہمیں پہاڑی کے دوسری طرف عمان کے شہر میں پہنچنا تھا۔ سڑک اچھی حالت میں تھی لیکن چڑھائی سخت ہونے کی وجہ سے گاڑی کی رفتار پندرہ بیس کلومیٹر فی گھنٹہ ہو گئی۔ بعض اندھے موڑ مڑتے وقت گاڑی کا کنڈیکٹر اتر کر اسی طرح پتھر ٹائروں کے نیچے رکھتا تھا جس طرح وطن عزیز کے پہاڑی سفر میں کنڈیکٹر کرتے ہیں۔ وطن عزیز میں کنڈیکٹر تو بعض اوقات ہر موڑ مڑتے وقت ساتھ پتھر بھی اٹھا کر چلتے ہیں لیکن یہاں پتھروں کی بہتات تھی اس لئے کنڈیکٹر کو پتھر اٹھا کر ساتھ ساتھ دوڑنے کی

نوبت پیش نہ آئی۔ گاڑی آہستہ آہستہ چل رہی تھی اس لئے ہمیں نزدیک اور دور تک کے علاقے کو دیکھنے کا موقع ملتا رہا۔ چڑھائی چڑھتے ہوئے مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے میں میر پور سے پیر گلی یا راولپنڈی سے مری جا رہا ہوں۔

اصحاب کہف کا غار

اسی پہاڑی سفر کے دوران گائیڈ نے مغرب کی طرف اشارہ کر کے بتایا کہ اصحاب کہف کا غار اُدھر ہے۔

یہ وہی غار ہے جس کے بارے میں قرآن پاک کی سورہ الکہف میں ارشاد خداوندی ہے:

> ''تم انہیں غار میں دیکھتے تو تمہیں یوں محسوس ہوتا کہ سورج جب نکلتا ہے تو ان کے غار کو چھوڑ کر دائیں جانب چڑھ جاتا ہے۔ اور جب غروب ہوتا ہے تو ان سے بچ کر بائیں جانب اتر جاتا ہے اور وہ غار کے اندر ایک وسیع جگہ میں پڑے ہیں۔ یہ اللہ کی نشانیوں میں سے ایک ہے۔''

اس غار کی صورت حال واقعی ایسی ہے کہ ادھر سورج کا رخ نہیں پڑ سکتا۔ ہم گاڑی سے اتر کر اس غار کو دیکھنے نہ جا سکے۔

اصحاب کہف کی غار کے بارے میں ہمیں دمشق میں بھی بتایا گیا تھا کہ وہ قاسیون کی پہاڑیوں میں واقع ہے۔ اس کا ذکر میں دمشق کے باب میں کر چکا ہوں۔

یوں ہی سفر جاری رہا۔ اس پہاڑی پر کوئی درخت نہیں تھا نہ ہی ہریالی تھی۔ ممکن ہے اس کی بلندی کی وجہ سے ایسا ہو۔ یہ سرخ رنگ کی ریتلی اور اونچی پہاڑی ہے۔ کوئی تیس میل کا سفر طے کر کے ہم پہاڑی کے بالکل اوپر سالٹ نامی قصبہ میں پہنچے۔ یہ ایک چھوٹا سا خوبصورت قصبہ ہے۔ اب ہمارے سامنے پہاڑی کے نیچے عمان شہر اور پشت کی طرف بیت المقدس تھا۔ اگر موسم ٹھیک ہو تو اس قصبہ سے بیت المقدس نظر آ جاتا ہے۔ اور اگر بیت المقدس میں موسم ٹھیک ہو تو وہاں سے یہ پہاڑی اور قصبہ نظر آتا ہے۔

پہاڑی کے اوپر سے ہم نے نیچے وادی فلسطین پر اور دور پہاڑیوں کے اوپر بیت المقدس پر آخری نگاہ ڈالی تو گاڑی موڑ مڑ کر نیچے کی طرف سفر کرنے لگی۔ ڈھلان میں گاڑی نے بقیہ سفر تیزی سے طے کرنا شروع کر دیا۔

عمان

کچھ دیر بعد ہم عمان شہر کی حدود میں داخل ہو گئے۔ سب سے پہلے ہم عمان یونیورسٹی کے علاقہ میں پہنچے جہاں یونیورسٹی کی عالی شان عمارتیں اور ہوسٹل تھے۔ سڑکیں خوبصورت اور دو رویہ نما تھیں۔ سڑک پر جگہ جگہ اردن کے بادشاہ کی تصویریں اسی طرح لگی ہوئیں دیکھیں جس طرح شام میں حافظ الاسد کی اور بغداد میں صدام حسین کی تھیں۔

یہ تصویری وبا میں نے اسرائیل میں نہیں دیکھی۔

مسلمان سربراہوں کو سڑکوں پر اپنی تصویریں لگوانے کا شوق دیکھ کر مجھے اکبر الہ آبادی کا شعر یاد آیا:

دوزخ کے داخلہ میں نہیں ان کو عذر کچھ
فوٹو کوئی لگا دے جو ان کا بہشت میں

یونیورسٹی کے علاقہ سے گزر کر ہم شہر کے وسط میں پہنچ گئے۔ 2:30 بجے ہماری گاڑی ''الواحہ ہوٹل (AL-WAHA)'' کے سامنے آ کر رکی۔ گائیڈ نے کہا کہ ہمیں دوپہر کا کھانا اسی ہوٹل میں کھانا ہے۔ یونیورسٹی کے علاقہ میں ہم نے اس سفر کے دوران پہلی بار میکڈونلڈ ریستوران دیکھا تھا لیکن گائیڈ نے ہمیں امریکی کھانوں کی بجائے عربی کھانا کھانے پر مائل کیا۔

عمان شہر پہاڑیوں کے دامن میں ہے۔ میں یہ لکھنے والا تھا کہ یہ میرپور کی مانند ہے لیکن فرق یہ ہے کہ میرپور کا شہر ایک چھوٹی پہاڑی بلاہ گالہ کے اوپر آباد ہے جبکہ عمان شہر ایک بڑی پہاڑی کے دامن سے شروع ہو کر پہاڑی کے درمیان تک پھیلا ہوا ہے۔ مجھے یہ شہر ٹاور فلیٹوں کا شہر نظر آیا۔ جدھر دیکھا اونچے اونچے ٹاور فلیٹ تھے، یورپی ملکوں کی طرح۔

عمان کا موسم بھی فلسطین کے موسم کی طرح معتدل تھا۔ دھوپ اور قابل برداشت گرمی۔ ہم کوٹ پہنے بغیر ایک قمیض میں شہر میں گھومتے رہے۔

ہوٹل میں دوپہر کا کھانا کھایا۔ کھانا بہت ہی لذیذ تھا اور عرب کے روایتی انداز میں تیار کیا گیا تھا۔ کھانا کھانے کے بعد ہم اس دفتر گئے جہاں سے ہمیں اپنا وہ سامان لینا تھا جسے ہم نے اسرائیل جاتے وقت گائیڈ کے ہاتھ عمان بھیج دیا تھا۔

سامان لے کر گاڑی میں رکھا تو ہمیں عبدالکریم بھی مل گے۔ وہی عبدالکریم

جنہوں نے ہمارے اس سارے سفر کا بندوبست کیا تھا۔

دو گھنٹے عمان کے شہر میں قیام کرنے اور گھومنے پھرنے کے بعد ساڑھے چار بجے شام کے دارالخلافہ دمشق کو چل پڑے جہاں سے آج رات ہمیں جہاز کے ذریعے واپس برطانیہ جانا تھا۔

کریم نے بتایا کہ عمان سے شام کی سرحد تک کا سفر 90 کلومیٹر ہے۔ اس کے بعد سرحد سے دمشق کا سفر بھی 90 کلومیٹر ہی ہے۔ یہ 180 کلومیٹر کا سفر ہمیں رات نو بجے سے قبل طے کرنا تھا۔ دمشق سے ہماری فلائیٹ رات ساڑھے دس بجے تھی۔

ہم نے اسی گاڑی میں سفر جاری رکھا جو ہمیں اردن کی سرحد سے لائی تھی لیکن یہاں گائیڈ اتر گیا اور اس کی جگہ عبدالکریم نے سنبھال لی۔ اب سفر زیادہ تر ڈھلان کی طرف تھا۔ ہم چھوٹے چھوٹے گاؤں اور قصبوں میں سے گزرتے ہوئے زرقا پہنچے۔

زرقا

عمان سے 25 کلومیٹر دور زرقا نامی شہر ہے۔ زرقا عمان شہر کے دامن سے تھوڑی دور ہے۔ شہر کے عین درمیان سے دریائے زرقا گزرتا ہے۔ اس دریا کو اگر ندی کہیں تو بہتر ہوگا۔ یہ اپنے ملک کے پہاڑی نالوں کی طرح ہے۔ پل پر سے گزرے تو ندی میں بہتے پانی کا شور بہت سہانا معلوم ہوا۔

زرقا کی ندی دیکھی تو مجھے ستر کی دھائی میں بننے والی ریاض شاہد مرحوم کی فلم ''زرقا'' یاد آئی۔ یہ فلم مسئلہ فلسطین کے حوالے سے تیار کی گئی تھی۔ فلم میں مرکزی کردار ادا کرنے والی عورت نیلو تھی جس نے فلم میں زرقا نامی ایک فلسطینی لڑکی کا کردار ادا کیا تھا۔ اس لافانی کردار کو نیلو نے اس خوبصورتی سے ادا کیا تھا کہ لوگ آج تک نیلو کو یاد کرتے ہیں۔ اس فلم نے پاکستان اور دنیا کے دوسرے ممالک میں کافی دھوم مچائی تھی۔

زرقا فلم کے یاد آتے ہی حبیب جالب کا لکھا ہوا نغمہ جسے مہدی حسن نے اپنی پرسوز آواز میں بڑی خوبصورتی سے گایا تھا میرے کانوں میں گونجنے لگا:

تو کہ ناواقفِ آداب غلامی ہے ابھی
رقص زنجیر پہن کر بھی کیا جاتا ہے

آج قاتل کی یہ مرضی ہے کہ سرکش لڑکی
سرِ مقتل تجھے کوڑوں سے نچایا جائے

موت کا رقص زمانے کو دکھایا جائے
اس طرح ظلم کو نذرانہ دیا جاتا ہے
رقص زنجیر پہن کر بھی کیا جاتا ہے

دیکھ فریاد نہ کر سر نہ جھکا پاؤں اٹھا
کل کو جو لوگ کریں گے تو ابھی سے کر جا
ناچتے ناچتے آزادی کی خاطر مر جا
منزل عشق میں مر مر کے جیا جاتا ہے
رقص زنجیر پہن کر بھی کیا جاتا ہے

کل بھی فلسطینی لڑکیاں ''ظلم کو نذرانہ'' پیش کرتی تھیں اور آج بھی۔اب اس مشن میں کشمیری عورتیں بھی شامل ہو چکی ہیں۔آج کشمیری نوجوان، عورتیں، بچے اور ضعیف سب وطن کی آزادی کی خاطر جانوں کے نذرانے پیش کر رہے ہیں۔وادی کشمیر کے جو کھیت زعفران کے پھولوں سے رنگین تھے آج وہ کھیت شہیدوں کے خون سے رنگین نظر آتے ہیں۔

دنیا دیکھ رہی ہے، ایک طرف غلام قومیں آزادی کی جدو جہد میں مصروف ہیں اور دوسری طرف آزاد مملکت کے حکمران آزادی کی نعمت سے بیگانہ اپنے ملک کو لوٹنے میں مصروف ہیں۔دونوں ہاتھوں سے لوٹی ہوئی ملکی دولت سے لندن میں ''سرے محل'' اور ''مے فیئر'' فلیٹ خرید کر بے قصور، بے گناہ، شریف، مظلوم اور پتہ نہیں کیا کیا ہیں۔

میں سوچنے لگا کہ یہ لوگ تو ملک کو باپ کی جاگیر سمجھ کر لوٹ رہے ہیں لیکن پھر سوچا باپ کی جاگیر کو تو کوئی بھی نہیں لوٹتا۔یقیناً یہ کچھ اور .... سمجھ کر لوٹ رہے ہیں!

میں اپنی سوچوں سے نکل کر اردن واپس پہنچا جہاں زرقا ندی کے علاوہ زرقا نام کی ایک جھیل بھی ہے جو اربد شہر کے قریب ہے۔اسی جھیل کا پانی بہہ کر دریائے اردن کی شکل اختیار کرتا ہے۔

ہم نے زرقا کا شہر پار کیا تو ویران علاقہ شروع ہو گیا۔اب گاڑی بھی کسی چھوٹی پہاڑی کے اوپر جا رہی تھی اور کبھی نیچے۔کبھی میدانوں، کبھی جنگلوں اور کبھی صحرا میں۔کہیں کہیں سرسبز اور شاداب علاقے بھی نظر آئے۔آخر کار ہم اربد پہنچے۔

اربد

اربد کی آبادی 80,000 کے لگ بھگ ہے۔ عمان اور زرقا کے بعد یہ اردن کا تیسرا بڑا شہر ہے۔ عمان کی آبادی 1.5 ملین ہے۔ اربد کا شہر کافی خوبصورت ہے۔ یہ تعلیمی مرکز بھی ہے۔ یہاں کی یرموک یونیورسٹی بہت ہی مشہور ہے۔ اس شہر سے ہم عراق سے اسرائیل جاتے وقت گزرے تھے۔ یہاں سے اسرائیل کی سرحد زیادہ دور نہیں۔ ذرا آگے گئے تو ہمارے دائیں ہاتھ وہ علاقہ تھا جہاں رجب 15 ہجری کو جنگ یرموک کا واقعہ پیش آیا تھا۔

جنگ یرموک

اردن اور شام کی سرحد کے بالکل قریب بائیں طرف وہ تاریخی علاقہ ہے جہاں مسلمانوں اور رومی فوجوں کے درمیان جنگ ہوئی تھی اور رومیوں کو عبرت ناک شکست کھانی پڑی تھی۔ اس جنگ کو تاریخ میں جنگ یرموک کے نام سے جانا جاتا ہے۔ رومی فوجوں کے ہاتھ سے شام، حمص اور اردن کے علاقے نکل گئے تھے۔ چنانچہ رومی حکمران مسلمانوں کے ساتھ آخری معرکہ کے طور پر دو دو ہاتھ کرنا چاہتے تھے۔ رومیوں کی دو لاکھ فوج جمع ہوئی۔ ادھر ابی عبیدہؓ کی قیادت میں مسلمانوں کی تیس ہزار فوج تھی۔ پہلے حملے میں رومیوں کو سخت شکست کا سامنا کرنا پڑا اور انہوں نے بات چیت سے مسئلہ حل کرنے کی پیش کش کی۔

حضرت خالد بن ولیدؓ نے رومیوں کے ساتھ مذکرات کیے لیکن ان سے کوئی نتیجہ برآمد نہ ہوا۔ آخرکار وہ تاریخی اور حتمی جنگ ہوئی جس کے بعد رومیوں کی اس طرح کمر ٹوٹی کہ پھر دنیا میں کہیں اُن کے قدم جم نہ سکے۔ حضرت خالد بن ولیدؓ نے اپنی تیس ہزار فوج کو چھتیس چھتیس کی ٹولیوں میں تقسیم کیا۔ مقابلہ میں رومی فوج کی قیادت وہ پادری کر رہے تھے جو حجروں سے کبھی باہر نہیں نکلے تھے۔ انہوں نے صلیبیں اٹھائی ہوئی تھیں۔ تین ہزار عیسائیوں نے اپنے آپ کو لوہے کی زنجیروں سے باندھا ہوا تھا کہ ہم جان دے دیں گے لیکن بھاگیں گے نہیں۔ وہ بھاگے نہیں۔ لیکن زندہ بھی نہ رہے۔

اسلام اور کفر کا تاریخی مقابلہ ہوا۔ اس میں رومیوں کے ایک لاکھ ستر ہزار آدمی قتل ہوئے اور مسلمان فوج کے تین ہزار شہید ہوئے۔ اس شکست کے بعد رومی اس طرح عرب کی سر زمین چھوڑ کر بھاگے کہ پھر دوبارہ انہیں اس علاقہ کی طرف نظر اٹھا کر دیکھنے کی جرأت نہ ہوئی۔

میدانِ یرموک کے قریب ایک بازار میں ہماری گاڑی کھڑی ہوئی۔ سب ساتھیوں نے مقامی دکانوں سے تحفے اور عرب کی روایتی مٹھائی خریدی اور یوں آخری خریداری کے بعد ہم اردن کی سرحد سے اپنا سامان چیک کروا کر شام میں داخل ہو گئے۔ اب شام کے ساڑھے سات بج چکے تھے۔ اندھیرا چھا چکا تھا۔ شام کی سرحد سے دمشق تک کا 90 کلومیٹر سفر ہم نے ڈیڑھ گھنٹے میں طے کیا اور نو بجے شام کے دارالخلافہ دمشق پہنچے۔ یہ وہی جگہ ہے جہاں سے ہم نے دو ہفتے قبل اپنے سفر کا آغاز کیا تھا۔

دمشق سے لندن تک

دمشق کے ہوائی اڈے پر کاغذات کی چیکنگ کے بعد جب سامان کا وزن ہونے لگا تو ہمارے "فرقہ تصویریہ" نے سب سے پہلے اپنا سامان بک کروالیا۔ جب ہماری باری آئی تو پتہ چلا کہ جتنا سامان ہم اپنے ساتھ مفت لے جا سکتے تھے اتنے وزن کا سامان بک ہو چکا ہے۔ حاجی رشید، حاجی شاہپال، خالد محمود، حاجی کرامت حسین اور میرے سامان کا وزن ہونا ابھی باقی تھا۔

تحقیق پر پتہ چلا کہ ہمارے ہراول دستہ نے اپنے دو ہفتے کے سفر کے دوران تمام مزاروں سے تبرکات اور جہاں سے بھی ممکن ہوا پتھر اینٹیں جمع کر کے اپنے سامان میں باندھ لی تھیں۔ پھر جہاں موقع ملا انہوں نے دل کھول کر شاپنگ بھی کی۔ اب اپنا سامان بک کروا کر وہ صاحب اپنے کھونڈے کے سہارے آرام سے بیٹھے منہ میں نسوار ڈالے سب کا تماشہ دیکھ رہے تھے۔ مسئلہ بڑا نازک تھا۔ اس زیادتی پر کچھ ساتھی لڑائی جھگڑے پر تیار ہو گئے۔ آخر کار سات سو ڈالر کی اضافی ادائیگی کر کے ہم نے اپنا سامان بک کرایا۔

ہم نے کریم کو خدا حافظ کہا اور جہاز میں جا بیٹھے۔ جہاز وقتِ مقررہ پر رات

12:15 دمشق سے اڑا اور سوا ایک بجے بیروت اترا۔ وہاں سے ڈھائی بجے رات کو اڑا تو 6:15 بجے ایمسٹرڈم میں اترا۔ وہاں سے جہاز تبدیل ہوا اور دوسرے جہاز نے 7:15 بجے اڑان بھری اور 7:15 بجے ہی لندن کے ہوائی اڈہ ہیتھرو اترا۔ جہاز جس وقت اڑا اسی وقت اترنے کی وجہ یہ تھی کہ برطانیہ کا وقت یورپ کے وقت سے ایک گھنٹہ پیچھے ہے۔

ہیتھرو سے گاڑی میں بیٹھ کر بریڈفورڈ کے لئے روانہ ہوئے۔ راستے میں، میں نے اپنے دو ہفتے کے اس سفر کا جائزہ لیا تو ذہن میں کئی طرح کے خیالات اور یادیں ابھریں۔ مجھے عراق کے عوام کی حالت زار اور فلسطین کے مسلمانوں پر ہونے والے اسرائیلی یہودیوں کے ظلم اور پھر افغانستان، کشمیر اور دنیا بھر کے مسلمانوں پر ہونے والے ظلم نے سخت بے چین کیا تو دل سے دعا نکلی کہ اے خدا! مسلمانوں کو وہ جرنیل ایک بار پھر عطا کر جنہوں نے جنگ یرموک میں رومی فوجوں کے کشتوں کے پشتے لگا دیے تھے۔ میں یہ سوچ رہا تھا کہ گاڑی برطانیہ کے سب سے پرانے موٹروے ایم۔ ون پر پہنچ گئی۔ گاڑی موٹروے پر پہنچی تو ڈرائیور نے ٹیپ آن کر کے کیسٹ چلا دی۔ نور جہاں علامہ اقبال کا کلام بڑے سوز سے گا رہی تھیں۔

یا رب دل مسلم کو وہ زندہ تمنا دے
جو قلب کو گرما دے جو روح کو تڑپا دے

پھر وادی فاراں کے ہر ذرے کو چمکا دے
پھر شوق تماشا دے پھر ذوق تقاضا دے

محروم تماشا کو پھر دیدۂ بینا دے
دیکھا ہے جو کچھ میں نے اوروں کو بھی دکھلا دے

بھٹکے ہوئے آہو کو پھر سوئے حرم لے چل
اس شہر کے خوگر کو پھر وسعت صحرا دے

پیدا دل ویراں میں پھر شورش محشر کر
اس محمل خالی کو پھر شاہد لیلیٰ دے

اس دور کی ظلمت میں ہر قلب پریشاں کو
وہ داغ محبت دے جو چاند کو شرما دے
رفعت میں مقاصد کو ہمدوش ثریا کر
خودداری ساحل دے آزادی دریا دے
بے لوث محبت ہو بیباک صداقت ہو
سینوں میں اجالا کر دل صورت مینا دے
احساس عنایت کر آثار مصیبت کا
امروز کی شورش میں اندیشہ فردا دے
میں بلبل نالاں ہوں اک اجڑے گلستاں کا
تاثیر کا سائل ہوں محتاج کو داتا دے

کیسٹ کے ختم ہوتے ہی ''پیغمبروں کی سرزمین'' کا سفر بھی ختم ہوا۔

☆☆☆

یعقوب نظامی کی پہلی کتاب "پاکستان سے انگلستان تک" چھپی تھی تو ہاتھوں ہاتھ لیا گیا تھا۔ اب اُن کی دوسری کتاب "پیغمبروں کی سرزمین" چھپ رہی ہے۔ مجھے یقین ہے۔ کہ اس کی پذیرائی پہلے سے بڑھ کر ہوگی، چشم و دل ہوگی اور نقشِ ثانی نقشِ اول پر حاوی ہوگا۔

اس کتاب میں مذہب کی بوندا باندی (موسلا دھار بارش نہیں) شروع سے لے کر آخر تک ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ اس پر مستزاد صاحب کتاب کا اندازِ بیاں ہے۔ جو کبھی ہلکے پھلکے مزاح اور کبھی مذہبی پس منظر کے باعث ہر طرح کے قاری کو شروع سے لے کے آخر تک اپنے ساتھ رکھتا ہے۔

"پیغمبروں کی سرزمین" کا سفر کرتے ہوئے مصنف کے ساتھی ایسے حاجی حضرات ہیں جن میں سے بعض یہ سفر پہلے بھی کر چکے ہیں اور اکثر مزاروں کی زیارت کے تجربہ سے سرشار ہیں لیکن یکین شیو یعقوب نظامی ان کے تجربات سے بے نیاز، راستے کے ہر قصبہ، ہر شہر اور ہر زیارت کو ایک ایسے زاویہ سے دیکھتے ہیں، جس میں عقیدت کا جذبہ تو بہر حال ہے، لیکن عقل کی کسوٹی بھی مصروف کار ہے۔ وقت نے تاریخ کے گرد فسانہ و فسوں کے جالے بن رکھے ہیں۔ یعقوب نظامی نے دلائل اور علم کے ذریعے ان جالوں کو صاف کر کے حقیقت کو نمایاں کیا ہے۔ اس سلسلہ میں عراق اور اسرائیل کے کوائف بالخصوص خیال انگیز ہیں۔

(محمود ہاشمی، برمنگھم، برطانیہ)

عصر حاضر میں جب تحقیق جیسے محنت طلب کام سے گریز کا رجحان فروغ پا رہا ہے اور محض صاحب کتاب بننے کے لئے سطحی اور عامیانہ مسودوں کی جلد بندی کو رواج دیا جا رہا ہے، ان حالات میں یعقوب نظامی نے نہ صرف "پاکستان سے انگلستان تک" جیسی ٹھوس تحقیق پر مبنی کتاب لکھ کر اپنا اعتبار قائم کیا بلکہ برطانیہ میں اردو زبان میں تاریخ نویسی کے حوالے سے ایک سنگِ میل کی بنیاد رکھی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی پہلی کتاب کو ہاتھوں ہاتھ لیا گیا اور صاحبانِ علم نے ان کی ہر سطح پر ستائش کی۔

اس بار یعقوب نظامی کی جستجو کی منزل کوئی ایک ملک نہیں ان کا شوقِ سفر انہیں شام، عراق، اردن، اسرائیل اور فلسطین تک لے کر گیا جس کے بعد انہوں نے "پیغمبروں کی سرزمین" کے ضمن میں ایک سفر کی یادیں تحریر کی ہیں۔ مجھے توقع ہے ان کی یہ کتاب موجودہ عہد کے دیگر سفر ناموں سے اس لئے بھی مختلف ہوگی کہ انہوں نے ایک محقق اور مؤرخ کی نظر سے ہر منظر کا گہرا مشاہدہ کر کے بڑی دیانتداری سے تاریخی حقائق کے چہرے سے پردہ ہٹایا ہے۔ انہوں نے مسلمانوں کی عظمتِ رفتہ کے تناظر میں بہت سے بھید کھولے اور کئی چھپی ہوئی سچائیوں کا انکشاف کیا ہے ان کے طرزِ تحریر میں یہ پہلو بھی نمایاں ہے کہ انہوں نے تاریخی صداقتوں کو مختلف نظر سے دیکھا ہے۔ اور جس شخص کا زاویہ نگاہ مختلف ہو اس کے سفر کی یادیں پڑھنے سے تعلق رکھتی ہیں۔

فیضان عارف روزنامہ جنگ، لندن

عصر حاضر میں جب تحقیق جیسے محنت طلب کام سے گریز کا رجحان فروغ پا رہا ہے اور محض صاحب کتاب بننے کے لئے سطحی اور عامیانہ مسودوں کی جلد بندی کو رواج دیا جا رہا ہے۔ ان حالات میں یعقوب نظامی نے نہ صرف ''پاکستان سے انگلستان تک'' جیسی ٹھوس تحقیق پر مبنی کتاب لکھ کر اپنا اعتبار قائم کیا بلکہ برطانیہ میں اردو زبان میں تاریخ نویسی کے حوالے سے ایک سنگ میل کی بنیاد رکھی ہے یہی وجہ ہے کہ ان کی پہلی کتاب کو ہاتھوں ہاتھ لیا گیا اور صاحبان علم نے ان کی ہر سطح پر ستائش کی۔

اس بار یعقوب نظامی کی جستجو کی منزل کوئی ایک ملک نہیں ان کا شوق سفر انہیں شام، عراق، اردن، اسرائیل اور فلسطین تک لے کر گیا جس کے بعد انہوں نے ''پیغمبروں کی سرزمین'' کے ضمن میں ایک سفر کی یادیں تحریر کی ہیں۔ مجھے توقع ہے ان کی یہ کتاب موجودہ عہد کے دیگر سفر ناموں سے اس لئے بھی مختلف ہوگی کہ انہوں نے ایک محقق اور مورخ کی نظر سے ہر منظر کا گہرا مشاہدہ کر کے بڑی دیانتداری سے تاریخی حقائق کے چہرے سے پردہ ہٹایا ہے۔ انہوں نے مسلمانوں کی عظمت رفتہ کے تناظر میں بہت سے بھید کھولے اور کئی چھپی ہوئی سچائیوں کا انکشاف کیا ہے۔ ان کے طرز تحریر میں یہ پہلو بھی نمایاں ہے کہ انہوں نے تاریخی صداقتوں کو مختلف نظر سے دیکھا ہے۔ اور جس شخص کا زاویہ نگاہ ہو اس کے سفر کی یادیں پڑھنے سے تعلق رکھتی ہیں۔

فیضان عارف

labaik ya Hussain AS

anjumhasnain2008@yahoo.com